Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

پریمی رومانی اُردو شعر و ادب کے ایک باصلاحیت فن کار ہیں۔ آپ عالی کدل سرینگر کے ایک اہلِ علم کشمیری پنڈت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد ڈاکٹر برج پریمی، اردو اور کشمیری زبان و ادب کے نامور افسانہ نگار، محقق اور نقاد تھے۔ پریمی نے شعر و ادب کا پہلا درس انہی سے حاصل کیا اور پھر پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر مسعود حسین خان، پروفیسر عالم خوندمیری، اختر الایمان، پروفیسر قمر رئیس اور مظہر امام سے اکتسابِ فیض کیا۔ آپ نے ایم اے (اردو) کی ڈگری کشمیر یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ۱۹۸۶ء میں پریمی کو اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سے جدید اردو شاعری اور اقبال کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔

پریمی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۶۸ء میں شاعری سے کیا۔ سب سے پہلی نظم تارے بچوں کے لئے لکھی۔ ۱۹۷۵ء سے باقاعدہ طور پر لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۸۰ء میں پریمی کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کا پہلا مجموعہ "جدید اردو شاعری: چند مطالعے" شائع ہوا۔ "ردِ عمل" پریمی کی ایک اور تصنیف ہے۔ پریمی اردو اور کشمیری شاعری سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ ۱۹۹۶ء میں نیشنل سروس اسکیم جموں یونیورسٹی کے انعامی مقابلے میں آپ کی نظم "کشورِ ہندوستان" بہترین نظم قرار دی گئی اور اس پر آپ کو انعام سے نوازا گیا۔ پریمی رومانی آج کل جموں میں قیام پذیر ہیں اور علمی و ادبی کاموں میں منہمک ہیں۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تاثرات

پریمی رومانی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

TASURAT

BY PREMI ROMANI

Premi Romani

Distributors:

RACHNA PUBLICATIONS

"Tapasiya"

1/3, NASEEB NAGAR, PAMPOSH COLONY,
JANIPUR, JAMMU-180007 (TAWI)

"تاثرات" کی اشاعت کے لئے مجھے جو مالی امداد ریاستی کلچرل اکادمی
سے ملی ہے۔ اس کے لئے میں اکادمی کا شکر گزار ہوں؛
(پریمی رومانی)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تاثرات

پریمی رومانی

491.439
P88T

Gandhi Memorial College
SRINAGAR
Acc. No: 3534 23 (I)
Dated: ....

G.M.C.E.J
3534

رچنا پبلیکیشنز
تپسیا ۱/۱۳ نصیب نگر، ہمپوشش کالونی، جانی پور
جموں ۱۸۰۰۰۷ (توی)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

© پریمی رومانی

"تپسیا" ۳/۱ نصیب نگر ہمپوش کالونی جانی پور جموں ۱۸۰۰۰۷

رچنا آمیر نے
فوٹو لیتھو ورکس دہلی سے چھپوا کر
رچنا پبلی کیشنز جموں (توی)
سے شایع کی۔

کتابت: قاضی کاشمیری

Rs. 180/=
قیمت: ایک سو اسی روپے

تقسیم کار:

- انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر
راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
- مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
۳۱۰۸، گلی عزیز الدین وکیل کوچہ پنڈت لال کنواں دہلی ۱۱۰۰۰۶
- پاک بک سینٹر، پکا ڈنگا، جموں (توی)
- رچنا پبلی کیشنز
"تپسیا" ۳/۱ نصیب نگر، ہمپوش کالونی، جانی پور، جموں ۱۸۰۰۰۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اپنے بچوّں

میور

اور

کونپل

کے نام

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ترتیب

۱۔ اپنی بات ــــــ پریمی رومانی ــــــ ۹

نظم

۲۔ سیماب اکبر آبادی ۔ چند نئے مباحث ــــــ ۱۱

۳۔ حفیظ جالندھری ۔ ایک مطالعہ ــــــ ۱۹

۴۔ کشمیر کی ایک اقبال شناس شخصیت
ــــــ اثر صہبائی ــــــ ۲۷

۵۔ قتیل شفائی کے گیت ــــــ ۳۶

۶۔ بلبل کاشمیری ۔ شخص اور شاعر ــــــ ۵۰

۷۔ عنوان چشتی کی غزل ــــــ ۶۴

۸۔ عابد مناوری ۔ چند یادیں چند ملاقاتیں ــــــ ۷۱

۹۔ امر چند ولی کاشمیری ۔ چند یادیں ــــــ ۸۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

۱۰۔ منشی پریم چند کا آرٹ ———— ۹۲

۱۱۔ کرشن چندر اور اُن کا تخلیقی ذہن ———— ۹۹

۱۲۔ محمد یوسف ٹینگ —— ایک مطالعہ ———— ۱۰۷

۱۳۔ اختر محی الدین میرے مطالعے کی روشنی میں ———— ۱۱۴

۱۴۔ دراس کا ایک معروف قلم کار۔ عبد الغنی شیخ ———— ۱۲۵

۱۵۔ منظر اعظمی۔ چند تاثرات ———— ۱۳۱

۱۶۔ تبصرے ———— ۱۳۷

نیا آہنگ

دستِ چنار

گر بیاں جھوٹ بولتا ہے

مفتاحِ اقبال

رشکِ قمر

فکر و فن

اجنبی ہوا

تپسوی کون؟

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اپنی بات

'تاثرات' میرے تنقیدی و تحقیقی مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔
یہ کسی مستقل موضوع پر لکھی گئی کتاب نہیں ہے بلکہ میں نے شعروادب کے اُن نمایندہ فن کاروں کی شخصیت اور اُن کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے جو مجھے پسند ہیں اور جن کا میں نے وقتاً فوقتاً مطالعہ کیا ہے۔ اُردو شعروادب کی وسیع دنیا میں ایسے بیشمار قلمکار ہیں جن کی تخلیقات نے مجھے کسی نہ کسی طرح متاثر کیا ہے۔

مجھے شدت سے اِس بات کا احساس ہے کہ میں ہر ایک قلمکار کو زیرِنظر کتاب میں جگہ نہ دے سکا جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ اِس کوتاہی کو آیندہ دُور کرنے کی کوشش کروں گا۔

تاثرات میں شامل مضامین مختلف النوع موضوعات پر دال ہیں۔ اِس میں اُردو کے جلیل القدر شعرا اور افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ نئے قلمکاروں اور شاعروں پر میں نے اپنے نظریات اور تاثرات پیش کئے ہیں۔

اِس کے علاوہ کشمیری زبان کے بعض اہم قلمکاروں کو بھی اِس کتاب

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

میں شامل کر چکا ہوں تاکہ قارئین اُن کے فن پاروں سے مستفید ہو سکیں۔

اقبالیات سے متعلق موضوعات بھی اہم ہیں۔ ان موضوعات پر آج تک بیسیوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور اُن کی شخصیت اور فن پر مضامین کی تعداد میں بھی روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے لیکن پھر بھی بعض موضوعات تشنۂ تکمیل ہیں "تاثرات" میں بھی میں نے بعض اہم شعراء کی شاعری کو اقبالؔ کے حوالے سے جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب رہا ہوں اس کے بارے میں قارئین ہی میری رہنمائی کر سکتے ہیں۔

بعض اہم کتابوں پر تبصرے بھی "تاثرات" کی زینت بن چکے ہیں۔ اُمید ہے کہ آپ ان کا بھی مطالعہ کریں گے اور مجھے ہمیشہ کی طرح اپنی رائے سے آگاہ کرتے رہیں گے۔ ان میں سے بعض مضامین شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی کی طرف سے وقتاً فوقتاً منعقد کیے گئے سمیناروں میں پڑھے گئے ہیں اور بعض ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔ میں ان مضامین کو بھی متعلقہ علمی و ادبی نیز نشریاتی اداروں کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہا ہوں۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۹۷ء

پریمی رومانی
'تپسیا'
۳/۱ نصیب نگر، ہمپوش کالونی
جانی پور، جموں۔ ۱۸۰۰۰۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سیمابؔ اکبرآبادی ۔ چند نئے مباحث

سیمابؔ اکبر آبادی تاریخِ ادب میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے نظم و نثر دونوں شعبوں میں کارنامے انجام دیئے لیکن بنیادی طور پر وہ ایک شاعر تھے اور شاعری کی ہر صنف پر قدرت رکھتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے غزل اور نظم کے علاوہ شاعری کی دوسری اصناف میں بھی اپنے جوہر دکھائے۔ لیکن سیمابؔ کی اصل دلچسپی نظم سے تھی جسکو وہ ہمیشہ سب سے بہتر صنفِ کلام کا نام دیتے تھے۔ ایک جگہ اپنے خیال کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"نظم، غزل گوئی سے زیادہ ضروری اور بہتر صنفِ کلام ہے۔"[۱]

سیمابؔ کی شاعری شروع سے ہی ایک نئے انداز سے سامنے آئی۔ انہوں نے اپنے جذبے اور احساس کی گہرائیوں کو نئے آہنگ سے پیش کر کے ایک نئے شعری دبستان کا آغاز کیا۔ اس کا ثبوت اُن کے کلیم عجم، سدرۃ المنتہیٰ، کارِ امروز، سازو آہنگ، شعرِ انقلاب، عالم آشوب، نیستان، تفسیرِ غم، سرودِ غم، لوحِ محفوظ اور سازِ حجاز وغیرہ جیسے مجموعوں سے ملتا ہے۔

---

[۱] ماہنامہ "شاعر" بمبئی جلد ۴۰ شمارہ ۱ جنوری ۱۹۶۹ء ص ۱۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سیماب اکبرآبادی کا نام عاشق حسین تھا۔ وہ ۱۸۸۰ء میں اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد مولانا محمد حسین صدیقی مرحوم ٹائمس آف انڈیا پریس (اجمیر شریف) میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ وہ بڑے دین دار، پرہیزگار اور شریف النفس بزرگ تھے اور مذہبی کاموں میں کافی دلچسپی لیتے تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے عاشق حسین کو عربی اور فارسی کی تعلیم دلائی۔ بعد میں مقامی انگریزی اسکول میں داخل کرایا جہاں سے اُنہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد سیماب نے اعلیٰ تعلیم کیلئے گورنمنٹ کالج اجمیر میں داخلہ لیا۔ یہاں سے ہی اُن کی شعر گوئی کا آغاز ہوتا ہے۔ سیماب کی طبیعت چونکہ بچپن سے ہی شعر گوئی کی طرف مائل تھی، کالج میں مولوی سید بدرالدین قریشی اکبرآبادی مرحوم، مولوی تحسین علی اجمیری مرحوم اور مولوی عابد جیسے اساتذہ کی صحبت میں رہ کر شعر گوئی کا ذوق پیدا ہو گیا اور نصاب میں جتنے بھی فارسی اشعار تھے اُن کو اُردو میں منتقل کرنے کے بعد اساتذہ کے سامنے پیش کرنا، اس دور میں سیماب کا معمول بن گیا تھا، جس پر اُن کے اساتذہ کافی خوش ہوتے تھے اور اُنہیں جامی، سعدی، عرفی، قاآنی وغیرہ جیسے اساتذہ فن کا مطالعہ کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ اسی مطالعے سے اُنہوں نے شعر و ادب کے رموز سے آگاہی حاصل کی اور اُن کے ذوقِ ادب کی تہذیب ہوئی۔

سیماب ۱۸۹۷ء میں اپنے والد کے سائے سے ہمیشہ کیلئے محروم ہو گئے۔ اُنہیں تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا اور گھر گرہستی کا سارا بوجھ اُن کے کندھوں پر پڑ گیا۔ اُن کو ملازمت کے سلسلے میں کانپور، آگرہ، اجمیر شریف وغیرہ کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ کانپور میں حکیم ازل لکھنوی، محب لکھنوی اور دیگر اساتذہ فن کی صحبت میں رہ کر اُن کی شعر گوئی میں نکھار پیدا ہو گیا۔ چونکہ سیماب کی طبیعت "دبستانِ دہلی" کی طرف مائل تھی اس لئے ۱۸۹۸ء میں سخا صاحب کی سفارش پر وہ نواب داغ کے تلمذ میں شامل ہو گئے۔[۱] داغ کی شوخی، فکر اور زبان و بیان کے رکھ رکھاؤ سے وہ کافی متاثر ہوئے، اس لئے سیماب کے یہاں اپنے استاد سے فن کی ایک نئی

---

[۱] سہ ماہی "اُردو ادب" علی گڑھ شمارہ ۲ ۱۹۶۷ء ص ۹-۱۰

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سمت پاکر خیالات اور طریقۂ اظہار میں مناسبت اور مماثلت کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔

سیمابؔ کے پاس جذبہ و احساس کی ندرت تھی جس کو داغ جیسے استاد نے جلا بخشی۔

سیمابؔ بچپن سے ہی شاعرانہ ذہن لے کے آئے تھے۔ اس لئے وہ ملازمت کی ذہنی غلامی برداشت نہ کر سکے۔ کچھ عرصہ ملازمت کر کے انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۲۳ء میں انہوں نے "قصرالادب" کے نام سے آگرے میں ایک ادارہ قائم کیا جہاں وہ باقاعدگی سے شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیتے رہے۔ سیمابؔ نے کئی رسائل و اخبارات بھی اپنی ادارت میں جاری کئے۔ جن میں رسالہ "مرصع" (آگرہ)، رسالہ "پیمانہ" ہفتہ وار، "تاج" اور ماہنامہ "شاعر" قابلِ ذکر ہیں۔

سیمابؔ علمی و ادبی کاموں میں زندگی بھر مصروف رہے۔ انہوں نے نظم و نثر میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ اس کے علاوہ شاگردوں کے کلام پر اصلاح دینا، رسائل اور اخبارات کے لئے اداریئے لکھنا، ادبی و شعری نشستوں میں شرکت کرنا، ممتاز رسائل و اخبارات کیلئے لکھنا، ان کی زندگی کا معمول بن گیا تھا۔ سیمابؔ ۱۹۴۹ء میں پاکستان تشریف لے گئے۔ وہاں بھی وہ علمی و ادبی کاموں میں مصروف رہے۔ آخری عمر میں اُن پر فالج کا حملہ ہوا اور اسی بیماری سے ۱۹۵۱ء میں رحلت کر گئے۔

سیمابؔ اکبرآبادی نے حسبِ رواج اپنی شعر گوئی کا آغاز غزل سے کیا اور اختتام بھی غزل پر ہی کیا۔ بقولِ رازؔ چاندپوری:

"اُن کی شاعری کی ابتداء غزل گوئی سے ہوئی تھی اور اس کی انتہا بھی غزل گوئی ہی پر ہوئی۔"[۱]

اس بات کے باوصف کہ شاعری میں اُن کا عشق نظم سے تھا، غزل سے اُن کی دلچسپی کسی دور میں بھی ختم نہیں ہوئی اور اُن کے متعدد شعری مجموعوں کے مطالعے

---

(۱) سہ ماہی "اردو ادب" علی گڑھ شمارہ ۳ ۱۹۶۷ء ص ۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اُن کی غزل، ان کی نظم سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے البتہ یہ ایک واقعہ ہے کہ اُس زمانے میں غزل کا بھرم ٹوٹ رہا تھا اور نظم کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کی جارہی تھی۔ اس لئے مولانا نے بھی غزل سے زیادہ نظم کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا۔ اور اسی سبب سے اسے "بے وقت کی شہنائی" اور "بے فصل کا نغمہ" کہا۔ چنانچہ ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

سیماب غزل گوئی اب اس کے سوا کیا ہے
بے فصل کا اک نغمہ، بے وقت کی شہنائی

سیماب نے غزل میں کچھ اصلاحات کرنا چاہیں جن سے غزل کی لطافت اثر انداز ہو سکتی تھی۔ اس لئے عام طور سے ان کو غزل سے زیادہ نظم کا شاعر کہا گیا لیکن اُس دور میں بھی نیاز فتح پوری جیسے ناقد نے اُن کی غزل گوئی کی تعریف کی تھی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سیماب فطرتاً شاعر پیدا ہوئے ہیں اور اس دور کے اچھا کہنے والوں میں ہیں۔ اگر وہ اپنی شاعری کو صرف غزل تک محدود رکھتے اور نظموں کے خارزار میں نہ اُلجھتے تو زیادہ کامیاب ہوتے اور تمام اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرنے سے بدرجہا بہتر صرف ایک صنف کو لے کر اس میں کمال پیدا کرنا ہے اور میں جانتا ہوں کہ اگر سیماب صاحب اپنی توجہ تمام تر غزل پر صرف کرتے تو آج ان کا مرتبہ دُنیائے شاعری میں اس سے زیادہ بلند ہوتا۔"[1]

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اپنی قادر الکلامی کے باوجود سیماب اپنی غزلوں میں کوئی انفرادی رنگ پیدا نہیں کر سکے۔ اگرچہ انہوں نے ہر رنگ میں شعر کہے اور کچھ تجربے بھی کئے لیکن عام طور

---

[1] نیاز فتح پوری: انتقادیات (حصہ اوّل) ص ۱۹۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سے وہ اپنی غزلوں میں وہ بات پیدا کرنے سے قاصر رہے جو غزل کا خاص جوہر ہے۔ اکثر نقادانِ فن نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ سیمابؔ کی غزلوں میں لطافتِ احساس کی کمی ہے یا وجدانی تاثر نہیں ملتا ہے۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری صحیح لکھتے ہیں:

"وہ خود بڑے مشاق شاعر ہیں اور شعر کہنے میں ان کو مطلق زحمت نہیں ہوتی۔ اُن کے ہاں کافی تعداد اچھے اشعار کی نکل آتی ہے۔ مگر ان میں کسی خاص جمالیاتی بصیرت یا وجدانی تاثر کا پتہ نہیں چلتا۔"[۱]

یہ کہنا ٹھیک نہیں ہوگا کہ سیمابؔ کی شاعری میں کوئی ذاتی اُپج نہیں ہے۔ اُن کی نظموں میں اُن کی اُپج کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اس طرح بات کرنے کے عادی ہیں جس سے قاری کو گمان ہوتا ہے کہ یہ اُس کے دل کی بات ہے، جو بڑے خوبصورت انداز میں شاعر نے بیان کی ہے۔ سیمابؔ کی نظمیں اصل میں اُن کے جذبے اور احساس کا اظہار ہیں۔ ایک نظم گو کی حیثیت سے اُن کا درجہ بلند و بالا ہے۔ انہوں نے بے شمار نظمیں لکھی ہیں، جو متنوع موضوعات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان نظموں میں شاعرانہ کمال کا احساس ہوتا ہے۔ نظم کے ساتھ اُن کی دلچسپی کا اظہار اُن کے ہی لفظوں میں ملاحظہ ہو:

"میں نظم کو غزل پر ترجیح دیتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ شعراء غزل سے زیادہ نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوں۔ اس لئے کہ غزل جس صنف کا نام ہے وہ اپنی قدامت اور کہنگی کی وجہ سے اب زیادہ کارآمد نہیں رہی۔ شعرائے متغزلین اس اس صنف کو بہ تمام و کمال پامال کرکے ختم کر چکے۔ منتہی شعراء کے لئے غزل میں اجتہاد کی گنجائش بہت کم باقی ہے۔ مگر نظم کا میدان ہنوز وسیع ہے اور یہ صنفِ سخن اردو شاعری کو کارآمد اور مفید بنا سکتی ہے۔ اس لئے زیادہ تر توجہ اس کی طرف ہونی چاہیئے۔"[۲]

---

[۱] مجنوں گورکھپوری: دوش و فردا (بحوالہ اُردو ادب شمارہ ۳، ۴ ۱۹۶۷ء ص ۱۳)

[۲] سیمابؔ اکبرآبادی: کلیمِ عجم ص ۳۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سیمابؔ کی نظمیں موضوعاتی اور تکنیکی اعتبار سے متنوع ہیں۔ انہوں نے اسلامی فکر و فلسفے کے ساتھ ساتھ وطنی، سیاسی اور اخلاقی موضوعات پر لکھا ہے۔ وہ اپنے دور کے بڑے نظم نگاروں میں شامل ہوتے ہیں۔ وہ شاعری کو جزوِ پیغمبری سمجھتے ہیں۔ اس لئے شعر کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ شعر کے حُسن کا بھی خیال کرتے ہیں۔ سیمابؔ کے موضوعات میں وطنیت اور سیاست کی بڑی اہمیت ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کے کئی سیاسی واقعات کو بیان کیا ہے۔ اسی طرح تصورِ انقلاب بھی اُن کی بیشتر نظموں میں جھلکتا ہے۔ اُن کی کئی نظموں میں انقلابِ روس کی گونج ملتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اشتراکیت سے بھی کسی زمانے میں متاثر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محنت کش طبقے کے بارے میں کئی نظمیں ملتی ہیں۔ سیماب کے یہاں فطرت کی منظر کشی بھی بدرجۂ اتم ملتی ہے، جس میں وہ ایک مصوّر نظر آتے ہیں۔ اُن کی منظر کشی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اُن کی نظم "فطرت کی جوگن" کا یہ بند ملاحظہ کیجئے: ؎

عروجِ شب ہائے ماہ کا ہے ضیا فضاؤں پہ چھا رہی ہے
عروسِ شب بے حجاب ہو کر تجلیوں میں نہا رہی ہے
چمک رہا ہے دُھلے ہوئے آسمان پر چاند چودھویں کا
ہوس کے بادل ابھی کھلے ہیں فضا کی خنکی بتا رہی ہے
فلک بھی روشن، زمین بھی روشن، مکاں بھی روشن، مکیں بھی روشن
جہان ہے اور روشنی ہے، نظر جہاں تک بھی جا رہی ہے
● ـــ (فطرت کی جوگن)

مجموعی طور پر موضوعات کے اعتبار سے سیماب کی نظموں کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ واقعاتی اور تخیئلی نظموں
۲۔ شاعرانہ اور فلسفیانہ نظمیں

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

۳۔ قومی اور سیاسی نظمیں

۴۔ بچوں کی نظمیں

واقعاتی اور تمثیلی نظموں کے سلسلے میں اُن کا مجموعۂ کلام "نیستان" پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان نظموں میں سیماب لطیف خیالات اور جذبات کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی مٹھاس سے ایک نئی دنیا خلق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ "کارِ امروز" کی نظمیں سیماب کے شاعرانہ اور فلسفیانہ خیالات پر دال ہیں۔ اسی طرح "ساز و آہنگ" میں اُنکے دوسرے موضوعات ملتے ہیں۔

سیماب کی شاعری کا ایک وسیع حصّہ اُن کی رُباعیات پر مشتمل ہے۔ "عالم آشوب" اُنکی خوبصورت رباعیوں کا مجموعہ ہے جس میں تقریباً پانچ سو رُباعیات شامل ہیں۔ اُن کی رُباعیوں کا اصل موضوع اُن کے وطنی اور قومی تصورات ہیں۔ یہاں حُسن و عشق کا کوئی دخل نہیں۔ ان رباعیوں میں بیشتر دوسری عالمگیر جنگ سے متعلق ہیں اور وہ کرنازیوں کے ظلم و استبداد کی کہانی سناتی ہیں۔ اگرچہ یہ رُباعیاں پروپگنڈائی اہمیت رکھتی ہیں اور اور حکومت کی فرمائش پر لکھی گئی ہیں لیکن پھر بھی اُن کی بڑی تاریخی اہمیت ہے۔ فرمان فتح پوری اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"ہر چند کہ یہ رباعیاں حکومت کے اشارے پر کہی گئی تھیں اور اُن کا مقصد برطانوی رعایا کے طبقے سے خوف و ہراس کو زائل کرنا تھا۔ پھر بھی سیماب کو تاریخ و صحافت شعر کے ڈھانچے میں ڈھالنے میں بڑی کامیابی ہوئی ہے۔ اکثر رباعیوں میں تاریخی واقعات، عام سیاسی اور قومی مسائل بڑی خوبصورتی سے نظم ہو گئے ہیں اور ان میں صحافتی رنگ کے باوجود ایک طرح کا شاعرانہ حُسن پیدا ہو گیا ہے۔"[۱]

سیماب نے خود اپنے تخلیقی سفر کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے اور ان کی خصوصیات سے

---

[۱] فرمان فتح پوری: اُردو رباعی (فنی و تاریخی ارتقاء) ص ۲۱۱ - ۲۱۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بحث کی ہے۔ پہلا دور ۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۸ء تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ اُن کا ابتدائی دور ہے۔ اس میں حُسن وعشق اور زُلف ورخسار کے مضامین نظم کئے گئے ہیں۔ دوسرا دور ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۸ء پر محیط ہے۔ اس دور میں اُن کے یہاں ہر طرح کے مضامین ملتے ہیں۔ لیکن اکثر غزلیں قافیہ پیمائی کی نذر ہو چکی ہیں۔ تیسرا دور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۸ء تک ہے۔ یہ اُن کی مقبولیت کا دور ہے اور طبیعت میں زبردست آمد ہے۔ خود لکھتے ہیں :

تکلّف برطرف، جہاں اور جب ضرورت ہوئی قلم جیب سے نکالا اور نظم یا غزل، جو کچھ کہنی ہوئی، کہہ ڈالی۔"[۱]

چوتھا دور ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۵ء تک ہے۔ یہ سیمابؔ کی شاعری کے عروج کا زمانہ ہے۔ اس دور کی خصوصیات خود اُن کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں :

"اب میرا ماحول قطعی روحانی اور مادیات کے تصور سے بھی خالی تھا اور اب بعض اوقات بغیر فکر بھی شعر دماغ پر نازل ہو جاتا ہے اور بعض اوقات تو یہ قطعاً معلوم ہوتا ہے کہ خدا بول رہا ہے اور بندہ لکھ رہا ہے"۔[۲]

اور آخری دور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۰ء تک کا ہے۔ اُس زمانہ میں انہوں نے "سازو آہنگ" اور "سدرۃ المنتہیٰ" کی ترمیم کی اور کلام پاک کا منظوم ترجمہ کیا۔

سیمابؔ اکبر آبادی اپنے دور کے ایک اہم شاعر تھے۔ اُن کی شاعری پاکیزہ جذبات سے بھری ہوئی ہے اور اس پر اُن کے طرزِ بیان کی نُدرت سونے پر سہاگہ کا کام دیتی ہے۔ اُنہوں نے اپنے تخلیقی سفر میں بہت سے تجربے کئے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ انھوں نے شعر وادب کی ناقابلِ فراموش خدمت انجام دی۔

---

[۱] سیمابؔ اکبر آبادی : کلیم عجم بحوالہ سہ ماہی اُردو ادب شمارہ ۳ ۱۹۶۷ء ص ۱۶

[۲] سیمابؔ اکبر آبادی : کلیم عجم بحوالہ سہ ماہی اُردو ادب شمارہ ۳ ۱۹۶۷ء ص ۱۷، ماہنامہ شیرازہ، سرینگر جلد ۲۳، شمارہ ۱-۶

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

حفیظ جالندھری

ایک مُطالعہ

ڈاکٹر سر محمد اقبال کے بعد جن شعراء نے اپنی فنکارانہ چابکدستی اور خداداد صلاحیت سے اپنا لوہا منوا لیا اُن میں حفیظ جالندھری کا نام اہم ہے۔ حفیظ نے غزل، نظم اور گیت جیسے اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ہے اور اُردو شعر و ادب میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کیا۔ انہوں نے جہاں ایک طرف اقبال کے رنگِ سخن کو اپنایا وہاں دوسری طرف اکبر الہ آبادی، چکبست لکھنوی اور اختر شیرانی جیسے شعراء سے بھی اکتسابِ فیض کر لیا اور اپنی تخلیقات میں ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا کر کے ان میں ایک نئی اور انفرادی بات پیدا کی۔

محمد حفیظ خاندانی نام، تخلص حفیظ کنیت ابوالاثر ۱۴ جنوری ۱۹۰۰ء کو جالندھر پنجاب میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد حافظ شمس الدین تھے۔ اُن کا خاندان مسلمان راجپوتوں کا خاندان ہے، جو مسلمان ہو جانے کے باوجود رانا کہلانے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ حفیظ جالندھری خود اپنے خاندان کے بارے میں ایک جگہ پر رقمطراز ہیں:

"میرا خاندان تقریباً دو سو (۲۰۰) برس پیشتر چوہان راجپوت کہلاتا تھا۔ میرے بزرگ ہندو سے مسلمان ہو گئے اور پاداش میں اپنی املاک وغیرہ کھو بیٹھے۔ البتہ سورج بنسی ہونے کا غرور مسلمان ہونے کے باوجود ساتھ رہا، میری ذات تک پہونچا اور ختم ہو گیا۔"[1]

حفیظ نے ابتدائی تعلیم جالندھر کی حوض والی مسجد میں حاصل کی۔ ۱۹۰۷ء میں مشن ہائی اسکول کی پرائمری

---

[1] ماہنامہ "نگار" لکھنو، جنوری و فروری ۱۹۴۱ء جلد ۳۹ شمارہ ۱-۲ ص ۱۱۳

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

شاخ میں داخل ہوئے۔ کچھ عرصہ دوآبہ آریہ اسکول میں بھی تعلیم پاتے رہے۔ شروع سے ہی شعر و شاعری اور قصّے کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا۔ باقاعدہ تعلیم ساتویں جماعت تک حاصل کی اور پھر اسکول اور گھر دونوں کو ترک کر دیا۔ خود اپنے ذوق کو اپنا رہنما بنایا اور اردو، ہندی، فارسی اور انگریزی میں اچھی استعداد حاصل کی۔ فارسی میں مولوی سید احمد علی شاہ سے خاصا فیض حاصل کیا۔

داغ دہلوی، مومن، کبیر داس، حسن نظامی، سر عبدالقادر، سر راس مسعود، سجاد حیدر یلدرم، بابا خلیل وہکا پیتر ویدی[1] ان کے معنوی استاد ہیں، جن سے انہوں نے خاصی بصیرت حاصل کی۔ ۱۹۱۵ء میں ٹائم کیپر کی حیثیت سے ۲۲ روپے ماہانہ پر بٹوے میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۱۶ء میں جالندھر میں عطر کی دکان کھولی پہلی جنگِ عظیم کے دوران فوجی وردیوں کی تیاری کا ٹھیکہ لیا۔ کچھ وقت سنگر کمپنی کے منیجر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران گورنمنٹ آف انڈیا کے محکمہ آئی اینڈ بی میں ملازم ہوئے اور سانگ پبلسٹی کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد قائدِ اعظم کے ایماء پر پاکستان مسلح افواج میں ڈائریکٹر آف مورال کی حیثیت سے ۱۹۵۷ء تک خدمات انجام دیتے رہے۔

حفیظ شروع سے ہی صحافت کے ساتھ دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کئی رسالے اور اخبار جاری کئے۔ بعض دوسرے اخبارات کے ساتھ بھی وابستہ رہے۔ ان میں سے خاص طور پر شباب (لاہور)، زمیندار، تبلیغ، ہزار داستان، نونہال، پھول، تہذیب النساء، حمایت الاسلام، مخزن، کارزار وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حفیظ کو وقتاً فوقتاً مختلف اعزازات اور خطابات سے بھی نوازا گیا۔ انہوں نے شعر و ادب میں کافی خدمات انجام دیں۔ پاکستان کا قومی ترانہ لکھنے کا شرف حفیظ صاحب کو ہی حاصل ہوا۔ حفیظ زندگی کی ۸۲ بہاریں دیکھنے کے بعد ۱۹۸۲ء میں لاہور میں وفات پا گئے۔

حفیظ کو لڑکپن سے ہی نعت خوانی کا شوق تھا اور بڑے شوق سے قوالی کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ اس زمانے میں جو کچھ انہوں نے سنا اس سے وہ متاثر ہوتے رہے۔ ۱۹۰۷ء میں انہوں نے پہلا شعر کہا ہے

محمدؐ کی کشتی میں ہوں گا سوار
تو لگ جائے گا میرا بیڑا بھی پار

شاید اسی شعر کے بارے میں حفیظ نے خود لکھا ہے :

"عمر کے ساتویں برس میں ایک دن راہ چلتے ایک محفل دیکھی جس میں کچھ بزرگوں کی زبانی بعد میں معلوم ہوا مشہور فارسی شاعر گرامی اپنا فارسی کلام سنا رہے تھے اور لوگ واہ واہ کر رہے

---

[1] ماہنامہ "افکار" (حفیظ نمبر) شمارہ ۱۴۴-۱۴۵، ۱۴۶، اگست ستمبر اکتوبر ۱۹۶۳ء ص ۳۶

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تھے۔ دوسرے دن کاٹھ کی تختی پر ہم نے اپنی پہلی نظم لکھ ڈالی، جس کو دیکھ کر ہمارے اُستاد نے ہمیں گدھا وغیرہ بنایا اور دو چار چپت بھی رسید کیے۔[ل]

یہ سات سال کے بچے کا شعر تھا۔ یہی شعور آہستہ آہستہ نکھرا اور وہ برصغیر کے بڑے شاعروں میں گنے جانے لگے۔ ۱۹۱۱ء میں جب وہ چھٹی جماعت کے طالب علم تھے، انہوں نے اپنی پہلی غزل لکھی تھی، مطلع تھا ؎

خواب میں دلدار کی تصویر ہم نے دیکھ لی
رات کو جاگی ہوئی تقدیر ہم نے دیکھ لی

۱۹۱۱ء میں جالندھر کے ایک اسکول کے مُدرّس سرفراز خان سرفراز کو اپنی چند غزلیں دکھائیں۔ اسی زمانے میں انہوں نے ساتویں جماعت کے بعد ہی تعلیم کو ترک کیا اور شعر گوئی کی طرف پوری دلچسپی کے ساتھ مائل ہوئے۔ جالندھر میں ان دنوں میں فارسی کے مسلم الثبوت شاعر مولانا گرامی کی مشاعروں میں دھوم مچا چکے تھے اور حیدرآباد کے دربار کے ساتھ منسلک ہو گئے تھے۔ چنانچہ حفیظ نے اُن کی طرف رجوع کیا۔ لیکن حضرت گرامی نے مشورہ دیا کہ وہ اپنے کلام کو خود دیکھ لیں اور انہوں نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ اس کی طرف خود اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"مجھے کسی نے مشورہ دیا کہ اپنا کلام حضرت گرامی کی خدمت میں دکن ارسال کروں اور اصلاح چاہوں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور چند غزلیں اُن کی خدمت میں ارسال کیں۔ جواب ملا 'گرامی فارسی کا شاعر ہے اُردو سے بہت دور، حفیظ جوہرِ قابل معلوم ہوتا ہے۔ حفیظ کو چاہیئے کہ اپنا کلام بار بار خود ہی ناقدانہ نظر سے دیکھا کرے' وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اس مشورہ پر عمل شروع کیا۔[ک] اور اس کے بعد اپنے ذوق کو ہی اپنا استاد بنایا۔"

حفیظ نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کر کے اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے۔ غزل، نظم، مسدس، گیت، بچوں کی نظمیں۔ ہر صنف میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ اُن کی اہم تصانیف میں نغمہ زار، سوز و ساز، تلخابۂ شیریں، شاہنامۂ اسلام، حفیظ کے گیت، اور نظمیں، ہندوستان ہمارا اور نثر میں ہفت پیکر، معیاری افسانے، انتخاب حالی مع مقدمہ اور متفرقات میں منظوم تاریخِ پاکستان وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ حفیظ کو پاکستان کا قومی ترانہ لکھنے کا شرف بھی حاصل ہے۔ اُردو میں آسان زبان میں گیتوں کو رواج دینے کی اوّلیت بھی انہیں حاصل ہے۔ اُردو نظم میں انہوں نے تکنیک کے تجربے بھی کیے چنانچہ اُن کی نظم "فرصت کی تلاش" اُن کا ایک انوکھا تجربہ

ل سہ ماہی "صحیفہ" (۲۶ واں شمارہ) جنوری ۱۹۶۴ء ص ۸۷

ک ماہنامہ "نگار" لکھنؤ جلد ۳۹ شمارہ ۱-۲ ص ۱۱۵ - ۱۱۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہے جس میں انہوں نے قدیم شعری اصولوں سے یکسر بغاوت کی اور عرصہ دراز تک اُنہیں اہلِ لکھنو بے تکا شاعر کہتے رہے۔[1]

حفیظ جالندھری اُس زمانے میں اُبھرے جب اکبر الہ آبادی، چکبست، اقبال، جوش، اختر شیرانی، حسرت موہانی، فانی، یگانہ، اصغر وغیرہ آسمانِ ادب پر طلوع ہو چکے تھے۔ اُن میں سے بیشتر لوگ سارے ملک میں مشہور ہو چکے تھے۔ حفیظ نے پے در پے نغمۂ زار، سوز و ساز اور شاہنامۂ اسلام کی چار جلدیں ایک دوسرے کے بعد منظرِ عام پر پیش کر کے ایک دھوم مچا دی۔ حفیظ نے شروع شروع میں جن شاعرانہ خوبیوں سے لوگوں کی توجہ مبذول کی، اُن میں اُن کا مترنم، چھوٹی چھوٹی بحروں کا استعمال، موسیقیت خاص طور پر اہم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے ایک چونکا دینے والی کیفیت پیدا کر دی۔ ایسی شاعری میں وہ نہ کسی سے متاثر نظر آتے ہیں اور نہ کسی کی تقلید کرتے ہیں۔ فراق گورکھپوری نے آج سے کوئی چالیس سال قبل لکھا تھا کہ حفیظ جالندھری کے گیتوں اور ترانوں میں جتنی تاثیر، سادگی اور ٹھوس پن ملتا ہے اس کا جواب کہیں اور نظر نہیں آتا۔ لکھتے ہیں:

"آواز کی یہ طیاری، یہ اُبلتی ہوئی جوانی، یہ بے تکلف اور بے لاگ رچاؤ اور نکھار، یہ شوخ اور چٹیلی رنگینی، یہ دھن، یہ سُریلا پن، یہ رنگ، یہ رس، یہ کسک اور یہ انگڑائیاں ہمیں آج تک کسی اُردو شاعر میں اور کہیں نہیں ملتیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصرعے اور اشعار کہے نہیں گئے ہیں بلکہ چھلک پڑے ہیں۔ حفیظ کی منظر نگاری خاص توجہ کی مستحق ہے۔"[2]

حفیظ کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت جس کی طرف فراق نے اشارہ کیا ہے، اس کی موسیقی اور نغمگی ہے۔ حفیظ شاعری اور موسیقی کے رشتے سے واقف ہیں اور وہ کولرج کی اس بات سے متفق نظر آتے ہیں کہ شاعری بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب ہے۔ ان کے فن کی سب سے بڑی خوبی شعر اور نغمے کا لطیف توازن ہے۔ سید ضمیر جعفری صحیح لکھتے ہیں:

"ایک لطیف و متوازن نغمگی اُس کے آرٹ کا سب سے بڑا حُسن ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ حواس میں بہتی ہوئی ایک بے نام لذت کو اس کی پوری مٹھاس، رس اور لوچ کے ساتھ اشعار میں نچوڑتا چلا جاتا ہے۔ اس کے الفاظ گاتے ہیں۔ مصرعے گنگناتے ہیں۔ نرم رواں دواں، کوئی ٹکڑا اٹکتا نہیں۔ کوئی لفظ کھٹکتا نہیں۔"[3]

---

[1] ماہنامہ "افکار" (حفیظ نمبر) شمارہ ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶ اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۳ء ص ۱۰

[2] ماہنامہ "نگار" اکتوبر ۱۹۴۱ء جلد ۴ شمارہ ۴ ص ۳۶

[3] ماہنامہ "افکار" (حفیظ نمبر) اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۳ء شمارہ ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶ ص ۰۰۰

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

نغمہ زار سے تلخابہ شیریں تک حفیظ نے ایک طویل تخلیقی سفر طے کیا ہے۔ شروع کی غزلوں میں داغ کا رنگ نظر آتا ہے۔ اس لئے شوخی کے ساتھ ساتھ سادگی اور صفائی بھی نظر آتی ہے۔ حفیظ نے داغ سے نہ صرف اسلوب کا رنگ سیکھا۔ لیکن جہاں تک غزل کی روح کا تعلق ہے وہ حفیظ کی اپنی ہے۔ حفیظ نے حتی الوسع معاملہ بندی سے پرہیز کیا اور اس کے برعکس فکر کی پاکیزگی کو اپنی شاعری میں برتا۔

سوز و ساز میں معاملہ کچھ مختلف ہے۔ اب اُن کی فکر گہری ہوتی چلی جا رہی ہے۔ لہجے کی تازہ کاری برقرار ہے یعنی انداز وہی آسان، سادہ اور رسیلا ہے لیکن خیالات میں گہرائی نہیں ہے "تلخابہ شیریں" میں تلخیاں نظر آتی ہیں اور اس کا سبب دوسری عالمگیر جنگ ہے۔ اسلوب میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن طنز کا رنگ بڑھ گیا ہے۔ طنز اور تلخی دراصل حالات کی پیدا کردہ ہے جس کے وسیلے سے حفیظ نے اپنے محسوسات کا اظہار کیا ہے۔ اس طویل سفر میں شاعر نے جو مشاہدے کئے اور جن تجربوں سے وہ گزرے، اُن سے اُسے آگہی اور ادراک حاصل ہوا۔ اس کا ذکر خود ہی تلخابہ شیریں کے مقدمے بقلمِ خود میں یوں کرتے ہیں :

"نغمہ زار کا دور لڑکپن سے عنفوانِ شباب تک کا زمانہ تھا۔ سلسلۂ مشق اور اظہار اُن تاثرات و احساسات کا تھا جن کی ہر بات انوکھی، سہانی اور خوشگوار تھی ....
بے فکری، خود نظری، لطافت، نزاکت .... ٹھنڈی ہوائیں، کالی گھٹائیں ....
سوز و ساز کے ڈانڈے بھی اسی سے ملتے جلتے۔ یہاں جیسے گرد و پیش کے دھندلے پن سے یکایک ایک شعلہ بھڑکے، پردے اٹھ جائیں۔ ہر منظر پیش نظر ہو ..... لیکن تلخابہ شیریں کیفیات میں "نغمہ زار" اور "سوز و ساز" دونوں سے الگ ہے۔ اس میں انفرادی اور نظری انانیت کا نشہ اُتر چکا ہے۔"[۱]

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ حفیظ نے اپنے تخلیقی سفر میں کن منزلوں کو چھوا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں

او دل توڑ کے جانے والے، دل کی بات بتاتا جا
اب میں دل کو کیا سمجھاؤں مجھ کو بھی سمجھاتا جا

○

ناکامئ عشق یا کامیابی — دونوں کا حاصل خانہ خرابی

○

فردوس کی طہور بھی آخر شراب ہے — مجھ کو نہ لے چلو مری نیت خراب ہے

---

۱ حفیظ جالندھری : تلخابہ شیریں ص ۲۴-۲۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

○

وہ سرخوشی دے کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کردے
میرے خیالوں میں رنگ بھر دے مرے لہو کو شراب کردے

○

کرتا ہے تصور تیرا اس رنگ کی باتیں — سُن لے کوئی اِک حرف تو افسانہ بنا دے

○

اہلِ زباں تو ہیں بہت، کوئی نہیں ہے اہلِ دل
کون تری طرح حفیظؔ درد کے گیت گا سکے

○

میری یہ زندگی ہے کہ مرنا پڑا مجھے — اک اور زندگی کی تمنا لیے ہوئے

○

ذوقِ نگاہ کے سوا، شوقِ گناہ کے سوا
مجھ کو بتوں سے کیا ملا، مجھ کو خدا نے کیا دیا

○

حفیظ کا ایک اہم کارنامہ "شاہنامۂ اسلام" ہے جو چار جلدوں میں چھپ چکا ہے۔ اس نظم میں تاریخِ اسلام کے اہم واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ نظم کا اسلوب جداگانہ ہے۔ اسمیں حفیظ کا منفرد رنگ جھلکتا ہے۔ حفیظ نے حقائق کے ساتھ ساتھ تخیل سے بھی کام لیا ہے۔ انہوں نے شاہنامہ میں نہ صرف بزرگانِ اسلام کی خوبیاں بیان کی ہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ ہر ایک بات اسلامی تعلیمات کے سیاق و سباق میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اپنے بیان کے حُسن کے باعث یہ نظم رزمیہ شاعری کے زمرے میں شامل ہوتی ہے۔

حفیظ جالندھری کے کلام کی ایک بڑی خوبی اس کی تاثیر ہے۔ مضمون میں کتنی ہی پیچیدگی کیوں نہ ہو، حفیظ جو الفاظ اور انداز اختیار کرتے ہیں اس سے نظم میں ایک عجیب لچک پیدا ہوتی ہے۔ غزل کے میدان میں حفیظ کا تخیل بھی داد دینے کے لائق ہے — مضامین کا اس قدر تنوع اپنی مثال آپ ہے۔ کہتے ہیں ؎

وہ عندلیبِ گلشنِ معنی ہوں میں حفیظؔ — سوزِ سخن سے آگ لگا دوں بہار میں

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

حفیظؔ کی غزل اگرچہ ہیئت کے اعتبار سے روایتی ہے مگر اس میں ان کا مخصوص رنگ نظر آتا ہے۔ دراصل موضوع کے اعتبار سے خیال اور احساس کی ندرت جس طرح حفیظؔ نے غزل میں سمودی ہے، وہ اُن کا ہی کام ہے۔ انہوں نے اپنے تخیل سے غزل کی سطح بلند کردی ہے۔ حفیظؔ کی غزل زندگی کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے ــــ اس میں سادگی اور فطری پن پایا جاتا ہے۔ حفیظؔ نے اپنے تجربوں کی بنیاد پر اپنی غزلوں میں ایک نیا انداز پیدا کردیا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے حفیظؔ کے ہر دور کی غزلیں ایک خاص انفرادیت رکھتی ہیں۔ یہ نغمہ اور آہنگ کا ایک خوبصورت امتزاج پیش کرتی ہیں۔ پروفیسر صدیق حکیم ان کی شاعری کو شبابیات کی شاعری کہتے ہیں[1] حفیظ کی غزلوں میں یوں تو عشقیہ جذبات پائے جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان میں فلسفیانہ نور باس بھی محسوس کی جاتی ہے۔

حفیظؔ کے گیت کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ وہ پہلے اُردو شاعر ہیں جنہوں نے گیت کی صنف کو زندگی سے ہمکنار کیا۔ دراصل ان کی صوتی ہم آہنگی اور گھلاوٹ نے جو اُن کی ہر صنفِ شاعری میں نظر آتی ہے، ان کے گیتوں کو جنم دیا۔ حفیظؔ کے گیتوں کا کمال یہ ہے کہ وہ اس گھلاوٹ کو پیدا کرنے کے لیے صرف ٹھیٹھ ہندی الفاظ ہی استعمال نہیں کرتے بلکہ سبک اور نرم فارسی اور عربی کے الفاظ سے بھی کام لیتے ہیں۔ گیتوں میں موضوعی اعتبار سے بھی فکر و تخیل کی بلندی ملتی ہے۔ چند گیتوں کے اقتباسات:

(۱)

کانھ مرلی والے نند کے لال — بنسری بجائے جا، بنسری بجائے جا
پریت میں بسی ہوئی اداؤں سے — گیت میں بسی ہوئی صداؤں سے
برج باسیوں کے جھونپڑے بسائے جا — سنائے جا، سنائے جا
کانھ مرلی والے نند کے لال — بنسری بجائے جا، بنسری بجائے جا

(کرشن بنسری)

(۲)

دریا میٹھے سمندر کھاری — سب میں تیرا فیض ہے جاری
راجا پرجا سب کھاتے ہیں — میٹھا اور نمک سرکاری
تیرے ہی گن گاتے ہیں سب — آبی۔ خاکی۔ نوری۔ ناری
اپنے اپنے رنگ میں تجھ کو — دیکھ رہی ہے دنیا ساری
مسجد میں بھی تیرے نمازی — مندر میں بھی تیرے پجاری

---

[1] ماہنامہ "افکار" (حفیظ نمبر) اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۳ء شمارہ ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ص ۵۴۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

دین بھی تیرا دھرم بھی تیرا　　اس سے کوئی نہیں انکاری

اس سے کون کرے انکار

تو ہی سب کا پالن ہار

حفیظؔ کا ایک اور کارنامہ بچوں کی شاعری ہے۔ وہ بچوں کے ادب میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بچوں کو نصیحت بھی کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اخلاقی درس بھی دیتے ہیں اور اس طرح سے اُن کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ کبھی کبھی بچوں کی سطح پر اُن کے ساتھ کھیلنے میں مصروف نظر آتے ہیں جب بھی انھیں موقعہ ملتا ہے تو بچوں کے اخلاق اور اعمال کی تہذیب کرنے سے نہیں چوکتے۔ وہ بچوں کی فطرت سے واقف ہیں۔ وہ ان کے دل میں محبت اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے خود بھی بچے بن جاتے ہیں۔

حفیظؔ جالندھری کے کلام کا ایک اجمالی جائزہ لینے کے بعد یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ وہ ایک سچے فنکار ہیں اور نہ صرف یہ کہ اُن کی شاعری ہیئت اور تکنیک کے اعتبار سے اہم ہے بلکہ موضوعات کے لحاظ سے بھی اُن کے یہاں رنگارنگی اور تنوع ہے۔ حفیظؔ کی شاعری میں سب سے بڑا حُسن اُن کی غنائیت ہے جو اپنی مُترنم لے، رس اور لوچ سے اُن کے پڑھنے والوں کو اس قدر متاثر کرتی ہے کہ انہیں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ (اور یہی) امتزاج اُن کو ایک اہم شاعر بناتا ہے۔

ماہنامہ شیرازہ، سرینگر، جلد ۳۳، شمارہ ۱۲،۱۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کشمیر کی ایک اقبال شناس شخصیت

ـــــ اثر صہبائی

ریاست جموں و کشمیر میں وقتاً فوقتاً بعض ایسے مشاہیرِ ادب بھی پیدا ہوئے، جنہوں نے اپنے قلم کی جولانی سے اُردو شعر و ادب میں نمایاں مقام پیدا کیا۔ ان مشاہیرِ ادب نے اپنی بیش بہا تخلیقات سے نہ صرف ریاست جموں و کشمیر کا نام روشن کیا بلکہ فرزندانِ کشمیر ہونے کا حق بھی ادا کیا۔ ان میں سے اقبالؔ [۱]، چکبستؔ، نسیمؔ، ہجرؔ، سرشارؔ، علامہ کیفیؔ، آغا حشرؔ کاشمیری، آنند نرائن ملاؔ، سعادت حسن منٹوؔ، رامانند ساگرؔ، قدرت اللہ شہابؔ، چراغ حسن حسرتؔ، اللہ رکھا ساغرؔ، محمد عمر نور الٰہیؔ، رفیق خاورؔ، حبیب کیفویؔ، محمود ہاشمی وغیرہ کے نام فخر کے ساتھ لئے جا سکتے ہیں۔ اثر صہبائی ایسے ہی مشاہیرِ ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

خواجہ عبدالسمیع پال نام، اثرؔ تخلص، اثر صہبائی کے نام سے ادبی حلقوں میں مشہور ہوئے۔ ان کے اسلاف کسی زمانے میں وادیٔ کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں آباد ہوئے۔ اثرؔ ۲۸؍ دسمبر ۱۹۰۱ء کو سیالکوٹ ہی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد مولوی احمد الدین پال جماعت اہلحدیث

---

[۱] ان میں سے بعض حضرات ملک کے دوسرے حصوں میں پیدا ہوئے۔ لیکن ان کے آباء و اجداد کشمیری تھے اور مختلف اوقات پر شدائدِ زمانہ سے تنگ آکر سیلاب و آگ کی تباہ کاری سے متاثر ہو کر ہندوستان کے دوسرے حصوں میں آباد ہوئے۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کے ایک فاضل بزرگ تھے۔ اثر نے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں پائی۔ ۱۹۱۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ ۱۹۲۲ء میں بی۔ اے اور ۱۹۲۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفہ میں ایم۔ اے کیا۔ کچھ عرصہ سیالکوٹ میں پریکٹس کرنے کے بعد جموں چلے گئے جہاں ۱۹۴۶ء میں سرکاری وکیل کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ اس کے بعد جموں وکشمیر ہائی کورٹ میں اسسٹنٹ ایڈ ڈیٹ مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کشمیر سے سیالکوٹ واپس آ گئے۔ یہاں اسسٹنٹ کسٹوڈین کے فرائض انجام دیتے رہے۔

اثر صہبائی جس زمانے میں اسلامیہ کالج لاہور میں زیر تعلیم تھے، وہ زمانہ سارے ملک میں سیاسی ہنگاموں کا زمانہ تھا۔ چنانچہ خلافت، ہجرت اور عدم تعاون کی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ گھر میں زبردست مذہبی ماحول تھا جس نے زندگی کی صالح قدروں سے محبت کرنا سکھایا تھا۔ چنانچہ تعلیم کے دوران جب قومی سطح پر تحریکیں شروع ہوئیں تو اثر صہبائی بھی ان کے اثرات قبول کرتے رہے اور اکثر و بیشتر ان تحریکوں میں عملی طور پر حصہ لیتے رہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میرے کالج کے ایام میں ہجرت، خلافت اور عدم تعاون کی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ میں ایک ایسا حساس نوجوان تھا جس کی زندگی کی عمارت شدید مذہبی جذبات پر اٹھائی گئی تھی۔ چنانچہ ان تحریکوں میں حصہ لیتا رہا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ تعلیمی اعتبار سے مجھے کچھ زیادہ خسارہ نہ ہوا۔"[۱]

اثر صہبائی کی خوشگوار ازدواجی زندگی بہت مختصر رہی۔ اُن کی بیوی راحت چار سال کی رفاقت کے بعد فوت ہو گئیں جو اُن کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ثابت ہوا اور جس نے اُن کی شاعری میں ایک نیا موڑ پیدا کیا۔ اس کا ثبوت اُن کا مجموعۂ کلام "راحت کدہ" ہے جو بعض نقادوں کے مطابق شاہجہاں کے "تاج محل" سے کچھ کم نہیں ہے۔[۲]

اثر صہبائی نے ۲۶ر جون ۱۹۶۳ء کو لاہور میں انتقال کیا۔

۱؎ روحِ صہبائی (شعری مجموعہ)۔ اثر صہبائی ص ۳ اور ۴

۲؎ اقبال (سہ ماہی) اکتوبر ۱۹۶۹ء جلد ۱۷ شمارہ ۲ ص ۴۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اثر صہبائی کو شعر و شاعری کے ساتھ شروع سے ہی مناسبت تھی۔ جب شعور کی عمر کو پہنچے تو اردو شاعری میں اقبال کے نغموں کی گونج تھی اور ٹیگور کے دل نشیں گیت جادو جگا رہے تھے پنجاب کے اہلِ علم حلقوں میں غالب کی شاعری کو خاص طور پر پسند کیا جا رہا تھا۔ اثر نے جب شاعری کا آغاز کیا تو ان اثرات سے دامن بچا نہ سکے۔ خود لکھتے ہیں:

"گیارہ بارہ برس کی عمر میں شعر گوئی کی ابتدا ہوئی۔ ان ایام میں غالب اور اقبال کی شاعری پنجاب پر چھائی ہوئی تھی۔ اُردو شاعری کا مطالعہ میں نے بھی انہی دو شاعروں کے کلام سے شروع کیا۔ ابھی سکول ہی میں تھا کہ ٹیگور کی شہرہ آفاق تصنیف "گیتانجلی" کا اُردو ترجمہ بھی دیکھا، جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔"[۱]

درج بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ اثر نے شاعری کا آغاز بہت ہی چھوٹی عمر سے کیا تھا۔ لاہور کے اسلامیہ کالج کی رنگین فضاؤں نے اس ذوق کو جلا بخشی۔ وہ شروع سے ہی اقبال کی شخصیت اور شاعری سے متاثر رہے۔ حافظ اور خیام سے بھی اکتسابِ فیض کیا۔ اس کے علاوہ شنکر آچاریہ، برگساں، بدھ، مہاویر، سری کرشن، حضرت عیسیٰؑ، سرورِ کائنات رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے بزرگانِ دین ہمیشہ ان کیلئے سرچشمۂ بصیرت رہے۔ اس کا اعتراف اپنی آپ بیتی میں یوں کرتے ہیں:

"علامہ اقبال کی شخصیت بالعموم اور اُن کی غیر فانی شاعری بالخصوص میری زندگی اور شاعری پر اثر انداز رہی ہے۔ متقدمین میں حافظ مغفور اور خیام مغفور کے اثرات میری شاعری میں نمایاں ہیں۔ دُنیا کے فلسفیوں میں برگساں اور شنکر آچاریہ مجھے خاص طور پر محبوب رہے ہیں۔ مذاہب کے بہت سے نکات قرآنِ کریم اور گیتا کے مطالعے سے حل ہوئے۔ سرورِ کائنات رسول عربیؐ میں مجھے انسانِ کامل ترین کی صورت نظر آتی ہے۔ ان کے علاوہ گوتم بدھ، مہاویر، سری کرشن اور حضرت عیسیٰؑ اور دیگر انبیاء علیہم السلام سے ہمیشہ متاثر ہوتا ہوں۔"[۲]

۱۔ روحِ صہبائی از اثر صہبائی ص ۳   ۲۔ سہ ماہی الزبیر (۷) آپ بیتی نمبر ۱۹۶۷ء ص ۳۱۸

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اس ضمن میں اُن کی کئی نظمیں، اشعار اور قطعات پیش کیے جا سکتے ہیں جن سے ان بزرگانِ دین، مفکّرین اور شعراء سے اثر صہبائی کی گہری عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔ 'تیری وحدت کے گیت گاتا ہوں'، دعا، نغمۂ عقیدت بحضور حضرت عمر خیام نیشاپوری، کائنات اور انسان، شاعر ـ سری کرشن، مہاتما گوتم بدھ، حضرت عیسیٰؑ اور سرورِ کائنات کے دربار میں، اور نروان، وغیرہ جیسی نظمیں اس سلسلے میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ چند نظموں کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

ساقیٔ کوثر سلام! شافعِ محشر سلام
حُسن کے مظہر سلام! عشق کے پیکر سلام
خلق کے رہبر سلام! ہادیٔ اکبر سلام
اے شہِ خیر الوریٰ! اے شہِ خیر الانام

تجھ پہ ہزاروں درُود! تجھ پہ ہزاروں سلام

● ـــ (سلام ـــ بحضور سرورِ کائناتؐ)

چھائی ہوئی باطل کی ہیں گھنگھور گھٹائیں — لبریز عفونت سے ہیں مسموم ہوائیں
تردید نے اُلفت کا گلا گھونٹ دیا ہے — باطل نے حقیقت کا گلا گھونٹ دیا ہے
کنس اور فلاطوس سے خونخوار ہیں لاکھوں — شہزادۂ ظلمت کے رضا کار ہیں لاکھوں
ہے پھیل چکی دامنِ عالم پہ سیاہی — ہر سُو نظر آتی ہے تباہی ہی تباہی
حق بیں بھی ہوں حق گو بھی حق کوش بھی ہوں میں — کچھ میکدۂ عشق کا مینوش بھی ہوں میں

● ـــ (شاعر ـــ سری کرشن، مہاتما گوتم بدھ، حضرت عیسیٰؑ اور سرورِ کائنات کے دربار میں)

ہو جس کے ہر اک قطرے میں سرمستیٔ جاوید — میخانۂ ہستی میں وہ پیمانہ عطا کر
ہے سازِ طرب بیخودیٔ رقصِ طرب دے — بے شاہد و مے جرأتِ رندانہ عطا کر
بے ہوش ہیں جو چونک اُٹھیں خوابِ گراں سے — ہنگامۂ آوازۂ مستانہ عطا کر
مٹی میں صنم خانۂ باطل کو ملا دوں — وہ گرزِ حق و ہمتِ مردانہ عطا کر

● ـــ (دعا)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

شروع شروع میں اثرؔ صہبائی اپنے بڑے بھائی امینؔ حزین سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ تک مولانا تاجور نجیب آبادی کے تلمذ میں رہے۔ اُس زمانے میں پنڈت برجموہن کیفی حکومتِ کشمیر کے اسسٹنٹ فارین سیکریٹری کے عہدے پر فائز تھے اور سردیوں میں کشمیر دربار کے ساتھ جموں منتقل ہوتے تھے۔ اثرؔ صہبائی ان کے حلقے میں شامل ہوئے اور کافی عرصہ تک اُن کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ چند دنوں تک اثرؔ لکھنوی کو بھی کلام دکھایا۔ اُس کے علاوہ ان کی خواہش یہ تھی کہ اُن کا کلام بڑے بڑے نقادانِ فن کی نظروں سے گذرے۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے عالموں نے اُن کی تخلیقات کو پسند فرمایا۔ اثرؔ صہبائی کو ان کی قیمتی آرا سے مستفید ہونے کا موقعہ ملا۔ اور اُن میں اعتماد کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خود لکھتے ہیں :

"مولانا سید سلیمان ندوی نے میری حوصلہ افزائی فرمائی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اپنی پسندیدگی کا اظہار فرما کر مجھ میں یقین و اعتماد کا جذبہ پیدا کر دیا۔"[۱]

اس کے علاوہ جموں کے دورِ قیام میں اثرؔ صہبائی کو ڈاکٹر تاثیر، خلیفہ عبدالحکیم اور اثرؔ لکھنوی جیسے دیدہ ور نقادانِ فن کے حلقے سے وابستہ ہونے کا شرف حاصل ہوا جن کے دم سے کشمیر میں اُردو ادب کا ایک دبستان کھل گیا تھا۔[۲] ان سب سے اثرؔ صہبائی نے شعوری اور غیر شعوری طور پر اثرات قبول کئے اور سب سے بڑھ کر وہ اقبالؔ کے کلام کی سحر طرازی سے متاثر ہوئے اور فکر و فن میں اُن سے اکتسابِ فیض کیا۔ اس کا کھلا ثبوت اُن کی شاعری ہے۔

اثرؔ صہبائی نے اپنی شاعری کا آغاز رباعیات اور قطعات سے کیا اور انہی دو اصناف تک اپنے آپ کو محدود رکھا۔ انہوں نے اس صنف میں اس قدر دسترس حاصل کی کہ وہ خیام العصر کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان اصناف میں انہوں نے حیاتِ انسانی کے مسائل اور فلسفیانہ نکات کو پیش کیا۔ اُن کی رباعیات کے دو مجموعے جامِ صہبائی (۱۹۲۸ء) اور جامِ طہور (۱۹۳۷ء) کے نام سے شائع ہو چکے ہیں اور دنیائے ادب سے خراج حاصل کر چکے ہیں۔ بعد میں وہ غزل گوئی کی طرف

---

[۱] روحِ صہبائی از اثرؔ صہبائی ص ۸

[۲] سہ ماہی اقبال اکتوبر ۱۹۶۸ء جلد ۱۷ شمارہ ۲ ص ۵۰

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

مائل ہوئے اور اس صنف میں بھی کمال دکھایا۔ انہوں نے نظم نگاری میں بھی طبع آزمائی کی اور اُردو شاعری کو بڑی جاندار نظمیں دیں۔ ان کے بعض دوسرے مجموعے "خمستان"، "راحت کدہ"، "روحِ صہبائی" اور "بامِ رفعت" وغیرہ ہیں، جن میں غزلیں، نظمیں، رباعیات اور قطعات ملتے ہیں۔

اثر صہبائی ایک فطری شاعر تھے۔ ان کے یہاں فلسفیانہ اور حکیمانہ خیالات کی فراوانی ہے۔ لیکن خیال کی گہرائی کے ساتھ ساتھ وہ زبان کے برتاؤ سے بھی واقف تھے۔ اس لئے وہ طبع موزون کے تقاضوں کے مطابق مختلف اصنافِ سخن میں اظہارِ خیال کرتے تھے۔ اثر صہبائی قیامِ کشمیر کے دوران کشمیر کی تحریکِ آزادی سے بالواسطہ طور پر وابستہ ہے۔ اگرچہ براہِ راست وہ عملی طور پر سیاست میں حصہ نہ لے سکے۔ لیکن ان کی تمام ہمدردیاں کشمیر کے مظلوم باشندوں کے ساتھ تھیں۔ اپنی بیشتر نظموں میں انہوں نے اس کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ اثر صہبائی نے ابتدا میں زیادہ توجہ منظر نگاری کی طرف کی۔ شروع کی نظموں میں قدرت کی رعنائیوں کی تصویر کشی بہت ہی خوبصورت انداز میں کرتے رہے۔ بعد کے برسوں میں قومی اور ملی مسائل سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ قیامِ کشمیر میں اُن کی شاعرانہ حس زیادہ بیدار ہوئی تھی اور کشمیر کے ملکوتی حُسن نے اُن کی شاعری کو جمال اور وقار بخشا۔ صہبائی کے یہاں عشق و محبت کے رنگین جذبات بھی ملتے ہیں جو اُن کے ابتدائی دور کی یادگار ہیں۔ لیکن بعد میں جوں جوں اُن کا شعور نکھرنے لگا، اُن کے یہاں فلسفیانہ مسائل سر اُٹھانے لگے۔ اثر صہبائی کی شاعری کا آخری دور نعت گوئی پر ختم ہوتا ہے۔ انہوں نے نعتوں کے لکھنے کا سلسلہ ۱۹۵۶ء میں شروع کیا۔ اور یہ سلسلہ اُن کی زندگی کے آخری لمحات تک برقرار رہا۔ اس سلسلہ میں ان کا مجموعہ "بحضورِ سرورِ کائنات"[1] چھپ چکا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنی فکر، فلسفہ اور فن سے نہ صرف اپنے مابعد شاعروں کو متاثر کیا بلکہ اپنے معاصرین پر بھی زبردست اثرات ڈالے۔ اثر صہبائی کے فکر و فن پر نظر ڈالتے ہوئے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی اقبال کے خیالات سے فیض حاصل کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں شاعروں میں فکری اور فنی سطح پر گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ اثر صہبائی نے خود اس

---

[1] سہ ماہی اقبال لاہور ۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء جلد ۱۷ شمارہ ۲ ص ۶۳

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بات کا اعتراف کیا ہے ۔ وہ اپنی آپ بیتی میں دوسرے اثرات کے ذکر کے ساتھ ساتھ علامہ اقبالؔ کی شاعری کے اثرات کا بھی ذکر کرتے ہیں ۔ چنانچہ ایک جگہ پر لکھتے ہیں :

"علامہ اقبالؔ کی شخصیت بالعموم اور اُن کی غیر فانی شاعری بالخصوص میری زندگی اور شاعری پر اثر انداز رہی ہے ۔"[۱]

اقبالؔ کی شاعری میں عشق کی بڑی اہمیت ہے ۔ عشق اقبالؔ کے مطابق حقیقت تک پہنچنے کا ایک طریقہ ہے ۔ اقبالؔ عشق کے توسط سے دل کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں کہ عشق کی یہی آماجگاہ ہے ۔ یہی سبب ہے کہ اقبالؔ نے عقل کے مقابلے میں کبھی عشق کا نہیں بلکہ دل کا نام لیا ہے ۔[۲] اقبالؔ کے مطابق عشق ایک مشعل ہے یا بصیرت کا منبع ہے جس سے انسانی عمل راہ اور روشنی پاتا ہے ۔ اسی ذوقِ عشق نے بڑے فنکار، بڑے عالم، بڑے قلندر اور سب سے بڑھ کر مردِ مومن پیدا کئے ہیں ۔ اقبالؔ کہتے ہیں ؎

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ ‏ ‏ عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ ‏ ‏ عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اُس پر حرام
عشق فقیہہ حرم عشق امیرِ جنود ‏ ‏ عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات ‏ ‏ عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

اثرؔ صہبائی بھی عاشق ہیں ۔ عشقِ مجازی کی تپتی ہوئی پیاس نے انہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے اور وہ اپنی شاعری کے آخری دور میں حقیقت سے عشق کرنے لگتے ہیں اور اُن کا کلام عشق کی کرامات سے شعلہ زن نظر آتا ہے ۔ عشق اُن کے لئے ذوقِ جستجو ہے ۔ وہ بے کیف زندگی پر جنونِ عشق کو ترجیح دیتے ہیں ۔ وہ عشق کو سرورِ جاوداں کہتے ہیں اور عشق کے راستے میں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ ان کے لئے بے معنی ہیں ۔ اثرؔ صہبائی عشق کے نشہ میں ڈوب کر بصیرت کی آنکھیں کھولتے ہیں اور اسے ہجر کی تلخی اور وصل کے کیف وسرور سے بلند تر چیز

---

[۱] تفسیر اقبالؔ از بہار الٰہ آبادی ص ۱۷۹

[۲] تفسیر اقبالؔ از بہار الٰہ آبادی ص ۱۷۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

قرار دیتے ہیں۔ وہ اکثر اشعار میں عشق کے ساتھ زندگی گذارنے کا ذکر کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سودا نقصان کا سودا نہیں ہے۔ اس میں صلہ بھی ہے اور انعام بھی۔ یہ سب خیالات فکرِ اقبالؔ کے مطالعے کا نتیجہ ہیں ــــ جیسا کہ ذکر ہوا ہے کہ اقبالؔ عشق کو ارفع درجہ دیتے ہیں اور اسے بصیرت کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ اسے سرورِ جاودان سمجھتے ہیں۔ ان سب خیالات کو اثرؔ صہبائی نے اپنے تجربات کی سان پر چڑھا کر پیش کیا ہے۔ لہٰذا یہ کہنے میں کوئی دو رائیں نہیں کہ اثرؔ کے یہ خیالات فکرِ اقبالؔ کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً ؎

میرے لیئے تو عشق ہے اک سرورِ جاودان
میں نہ کبھی سمجھ سکا جور ہے کیا ستم ہے کیا

○

بے کیف زندگی سے ہے بہتر جنونِ عشق
یہ بادہ تلخ تر ہی سہی ہائے وہُو تو ہے

○

عشق ہے اِک کیفیت ہجر و وصال سے بلند
اس کو نشاطِ وصل کیا، ہجر کا اس کو غم ہے کیا

○

عشق میں آتی ہے لذّت زہرِ غم کھانے کے بعد
زندگی ملتی ہے یاں جاں سے گذر جانے کے بعد

○

سرشاریاں عجیب تھیں صہبائے عشق کی
کیا خوب بے نیاز تھے دونوں جہاں سے ہم

حُسن کا تصوّر اکثر شعراء نے پیش کیا ہے۔ شروع شروع میں اقبالؔ حُسن کے احساس کا اظہار کرنے لگے تو اُن کا رنگِ سخن روایتی شاعری کے مانند تھا اور اُن کا تصوّرِ حُسن عام قسم کا تھا۔ لیکن جب اقبالؔ کی فکر و نظر بدل گئی تو تصوّرات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ ہر چیز میں حُسن دیکھنے لگے اور یہ وہ حُسن تھا جس میں انہیں حُسنِ مطلق نظر آنے لگا۔ حتیٰ کہ اقبالؔ کی شاعری کا دورِ دوم، دورِ حُسن و جمال ہے۔ اقبالؔ کی طرح اثرؔ صہبائی بھی حُسن کی حقیقت ساری کائنات میں دیکھ لیتے ہیں۔ اُن کو حُسن نہ صرف گُل کی رنگینی میں نظر آتا ہے بلکہ کانٹے کی چبھن میں بھی ملتا ہے۔ چاند، تارے، پھول، شبنم، شباب غرض کہ کائنات کے ہر ذرّے میں حُسن ہے۔ یہ شاعر

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کی چشم بینا ہے جس کے باعث گلستان کے ذرّے ذرّے میں، آسمانوں اور زمینوں میں حتیٰ کہ عشق کے داغوں میں بھی حُسن کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

اثر صہبائی کا تصورِ حُسن علامہ اقبال ہی کی طرح اُسی نور کی جستجو کرتا ہے جو اس کا مرکزِ تمنّا ہے اور ساتھ ہی ساتھ جمال کا پرتو بھی۔ وہ بھی چاند اور ستاروں اور کائنات کی ان گنت حسین اشیاء کو دیکھتا ہوا اپنے محبوب کے پاس پہنچنا چاہتا ہے، جو دراصل حُسنِ مطلق ہے۔ اس لئے نسوانی جمال اور دوسرے مظاہرِ جمال کو وہ محض استعارے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اثر صہبائی نے یہ تکنیک علامہ سے سیکھی ہے اور اُنہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت ذیل کے اشعار سے ہوتی ہے ؎

مے حُسن کی پیتا ہوں خمخانۂ ہستی سے — سب مجھ کو سمجھتے ہیں مے کش مری ہستی سے
اُس مست کو صہبائی ہم مست سمجھتے ہیں — حاصل نہ کرے مستی جو بادہ پرستی سے

○

اگر نہیں ہے ہر ایک شے پہ اُسی فروغِ نظر کا پرتو
تو پھر ہر اک جلوۂ حسیں پہ نگاہ یوں بے قرار کیوں ہے

○

گلزار کا پھول، پھول پیمانۂ حُسن — اشجار کی شاخ شاخ مستانۂ حُسن
دوشیزۂ صبح ہے صبح بر دوش — ہنگامۂ سحر چمن ہے مے خانۂ حُسن

○

اے کاش فروغِ نور ہو جائے دل — تاریک ہے برقِ طور ہو جائے دل
یا حُسنِ ازل کا آئینہ ہو جائے — یا ٹوٹ کے چور چور ہو جائے دل

○

مسکراتا ہوا جب کوئی حسین آتا ہے — اے خدا پھر تری ہستی کا یقین آتا ہے

○

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

حُسن ہی حُسن جلوہ فرما ہے   آسمانوں میں اور زمینوں میں

○

اشعارِ بالا سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اثر صہبائی کا تصوّرِ حُسن، حُسنِ مُطلق کی تلاش میں ہے اور اسی حُسنِ مطلق کا پرتو شاعر کو کائنات کے ذرّے ذرّے میں نظر آتا ہے۔ یہاں کسی جگہ پر بھی جسمانی حُسن کا تصوّر نظر نہیں آتا اور نہ ہی سستی حُسن پرستی کا، جو روایتی حُسن پرستی کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ یہ تصوّرِ حُسن کی یہ لَے اقبالؔ کے اشعار سے نئے انداز میں پھوٹتی ہے اور اثر صہبائی اس سے یقیناً متاثر ہوئے ہیں۔

علامہ اقبالؔ کی طرح اثر صہبائی نے بھی حیات کو ایک مخصوص نظر سے دیکھا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ مذہب میری زندگی اور شاعری کا اہم ترین عنصر بن چکا ہے۔ میرے نزدیک مذہب کی روح حق جوئی، حق گوئی اور حق پرستی ہے۔ اس اعتبار سے میں جملہ علوم وفنون پر مذہب کو حاوی اور محیط سمجھتا ہوں۔ یوں بھی مذہب انسان کے بلند ترین افکار، پاکیزہ ترین جذبات اور لطیف ترین احساسات کو بیدار کرتا ہے[ش] اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مختلف مسائل کو ایک مخصوص نظریئے سے دیکھتے ہیں۔ ایسے مسائل میں حیات کا مسئلہ بھی اہم ہے۔ اسلام کا سرچشمۂ فکر اسلامی تعلیمات ہیں اور اسلام اور قرآن کی روشنی میں انہوں نے مختلف مسائل پر جن میں حیات بھی ایک ہے، سوچا ہے۔ اثر صہبائی کی شاعری اس اثر سے الگ نہیں ہے۔ وہ اقبالؔ ہی کی طرح زندگی کو ایک ایسی آگ سمجھتے ہیں جو ساری زندگی انسانی وجود کے اندر سُلگتی رہتی ہے۔ اسی طرح وہ زندگی میں پیش آنے والے مصائب سے بھی نہیں ڈرتے۔ بلکہ اقبالؔ کی طرح درسِ عمل دیتے ہیں۔ اثر صہبائی رجائیت میں یقین رکھتے ہیں اور وہ کسی بھی مشکل میں گرفتار ہو کر فرار کا عمل اختیار نہیں کرتے کہ فراریت اور رہبانیت اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اقبالؔ نے بھی اسی لَے سے اپنے نغموں کو چھیڑا تھا۔ اثر صہبائی کے خیالات کو سمجھنے کے لیے ان کی نظم "اسرارِ حیات" سے چند شعر ملاحظہ فرمایئے۔

ش روحِ صہبائی (شعری مجموعہ) از اثر صہبائی ص ۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سطحِ دریا پہ اُبھر آتے ہیں ہم — بُلبلے ہیں تیرتے جاتے ہیں ہم
تیر کر لیکن ذرا کچھ دور تک — اس نئی ہستی سے گھبراتے ہیں ہم
تنگ آکر وحشتِ انکار سے — سر انہیں موجوں سے ٹکراتے ہیں ہم
ٹوٹ کر دریا میں ہو جاتے ہیں غرق — پھر سکونِ بے خودی پاتے ہیں ہم
خوب ہے نیرنگیٔ موت و حیات — بس یونہی بن بن کے مٹ جاتے ہیں ہم
کیا وہیں تھے ہم جہاں ہیں اے اثرؔ — یا کہیں جاتے ہیں یا آتے ہیں ہم

اس نظم کے علاوہ چند اور شعر ملاحظہ فرمایئے جن سے اثرؔ صہبائی کے نظریۂ حیات پر روشنی پڑتی ہے۔

ہے بزمِ حیات کی نہ پروا مجھ کو — ہے ظلمتِ موت کا نہ کھٹکا مجھ کو
ہر شام ہے خوابِ مرگ طاری مجھ پر — ہر صبح ہے اک حیاتِ تازہ مجھ کو

○

ناکامیٔ زندگی سے ڈرنا کیا — ہنگامِ شکست آہ بھرنا کیا؛
زندہ ہے اگر تو تنگ ہستی کیوں ہے — یہ موت سے پیشتر ہی مرنا کیا؛

○

نیرنگِ طلسم زندگی کو پایا — آلودۂ غم ہر اک خوشی کو پایا
تسکین ہے اگر تو ذکرِ یزداں میں اثرؔ — سرچشمۂ بے خودی اسی کو پایا

○

زندگی سوز ہے! کہ تا دمِ زیست — ختم یہ آہِ آتشیں نہ ہوئی

اقبالؔ اور اثرؔ صہبائی کئی اور میدانوں میں ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔ اقبالؔ کے پاس سب سے بڑی دولت ذوقِ یقین کی دولت تھی۔ وہ اسے مرد کی شمشیر سمجھتے تھے۔ اسی طرح اُن کا خیال تھا کہ ذوقِ یقین مردِ مسلمان کے لئے ایک قندیل ہے جس سے ظلمت اور شر کی سیاہ راتوں میں اُجالا ہو سکتا ہے۔ اقبالؔ یہ سمجھتے تھے کہ بڑے عالم کے پاس ذوقِ یقین کی دولت نہ ہو تو اُس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ذوقِ یقین ایک ایسی چیز ہے جس کے سہارے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سے غلامی کی زنجیریں کٹ سکتی ہیں ۔ ذوقِ یقین پر اثرؔ صہبائی کا بھی یقین تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ ذوقِ یقین ایک ایسی دولت ہے جس سے وہ عظمت حاصل ہوتی ہے جو رشکِ دو عالم ہو۔ اثرؔ نے اپنے اشعار میں اس بات پر زور دیا ہے کہ یہ ذوقِ یقین ہی ہے جو انسان کی روح ہے۔ دراصل ذوقِ یقین کی جستجو اثرؔ صہبائی کے اشعار میں ایک تڑپ پیدا کرتی ہے ۔ یہ اگر اقبالؔ کے لفظوں میں خمیرِ حیات کو پُر سوز بناتی ہے تو اثرؔ صہبائی کے لفظوں میں یہ ذوق خاتمِ ہستی کا نگینہ ہے۔ ذوقِ یقین کا یہ سوز دونوں شعراء کو تڑپاتا رہا ہے اور اُن کی شاعری میں ایک بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبالؔ کہتے ہیں ؎

مئے یقین سے خمیرِ حیات ہے پُر سوز　　نصیبِ مدرسہ یارب یہ آبِ آتشناک

○

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم　　جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

○

گماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلمان کا　　بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

○

اور اثرؔ صہبائی کے خیالات بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

درماندہ و گم گشتہ و آشفتہ نظر ہوں　　ہوں گرمِ سفر پھر بھی کہ مجبورِ سفر ہوں

مجروح دل و جاں ہیں کہ مجروح یقین ہے

مل جائے اگر "ذوقِ یقیں" کی مجھے دولت　　پھر اشکِ دو عالم ہے مری رفعت و عظمت

یہ ذوقِ یقیں خاتمِ ہستی کا نگیں ہے

• ——— (ذوقِ یقین)

اسی طرح انسان کا تصوّر دونوں کے یہاں مماثل ہے ۔ اقبالؔ کے نزدیک اس کائنات کا مقصودِ کل انسان ہے ۔ اس لئے بلند اور بالا اگر کوئی چیز ہے تو وہ صرف ذاتِ خداوندی ہے۔ اس لئے انسانی زندگی کی کوئی انتہا نہیں ہے ۔ اقبالؔ نے اپنی نظم "فرشتے آدم کو جنت سے رخصت

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کرتے ہوئے" اور "روحِ ارضی" میں انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ فرشتے جب آدم کو جنّت سے رخصت کرتے ہیں تو وہ اس سے کہتے ہیں کہ اگرچہ تمہاری تقدیر میں روز و شب کی بے تابی ہے لیکن تمہیں اپنی بھی خبر نہیں۔ تمہارے خمیر میں چاند اور ستاروں کی بے قراری بھری ہوئی ہے اور تم اتنے حسین ہو کہ خواب میں بھی اپنے حُسن کو دیکھ کر جھوم اُٹھو۔ تمہاری نوا سے زندگی کا خمیر بے نقاب ہوتا ہے۔ اسی لئے انسان کے اندر جو صلاحیتیں چُھپی ہوئی ہیں اُن کو دیکھ کر روحِ ارضی کھل اُٹھتی ہے اور جب وہ زمین کی طرف چلا جاتا ہے تو وہ اس کا استقبال کرتی ہے۔ روحِ ارضی اسے بتاتی ہے کہ یہ ساری کائنات تمہاری منتظر ہے۔ تمہارے آنے سے اُن کی قسمت جاگ اُٹھے گی۔

سی مقام پر اقبالؔ انسان کو خودی کا درس دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

خورشیدِ جہاں تاب کو ضو تیرے شرر میں　　آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہُنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں　　جنّت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

اقبالؔ نے انسان کو بہت بلند درجہ دیا ہے جس کا سب سے بڑا جذبہ، جذبۂ عشق ہے اور جس کی بدولت وہ لافانی زندگی کا مالک بن جاتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دُنیا میں　　انسان کی ہر قوّت، سرگرم تقاضا ہے
اس ذرّہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم　　یہ ذرّہ نہیں، شائد سِمٹا ہوا صحرا ہے
چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی　　یہ ہستیٔ دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے

(انسان) ——— •

روحِ انسانی کی اس بیکرانی اور وسعت کا اظہار اخترؔ صہبائی بھی کرتے ہیں۔ صہبائیؔ کا خیال ہے کہ انسان کی روح سراسر راز ہے اور اب تک اس راز کو کوئی سمجھ نہیں پایا ہے۔ سائنس نے سمندر کی گہرائیوں کو ناپ لیا ہے۔ انسانی عقل آسمان کے اُس پار کی خبر لے آتی ہے۔ گردشِ ایّام کا معمّہ انسانی عقل نے حل کیا ہے۔ لیکن انسان کیا ہے؛ وہ کس قدر بلند ہے؛ یہ آج تک کوئی سمجھا نہیں پایا ہے۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اثر صہبائی اقبال کے اس خیال کے قریب آجاتے ہیں کہ انسان آسمانوں سے برتر اور فرشتوں سے بلند تر ہے۔ چنانچہ ایک نظم "روحِ انسان" میں اپنے مؤثر انداز میں اس کا ذکر کرتے ہیں ؎

پا سکو شاید سمندر کی بھی تم گہرائیاں
کر سکو طے عالمِ امکاں کی بھی پہنائیاں

گن سکو شاید شعاعیں مہرِ عالمتاب کی
ڈھونڈ لو ممکن ہے راہیں انجم و مہتاب کی

کھول لو ممکن ہے گرہیں گردشِ ایام کی
جان لو شاید حقیقت دورِ صبح و شام کی

پھول باغِ آسماں سے چن سکو ممکن ہے یہ
نغمۂ ناہید بھی تم سن سکو ممکن ہے یہ

چیر کر موجیں فلک کے اس یمِ ذخّار کی
دیکھ لو ممکن ہے دُنیا خرچ کے اُس پار کی

روحِ انسان ہے مگر وہ بحرِ ناپیدا کنار
جس کی تہ ناپید ہے جسکی ہیں موجیں بیشمار

فنی لحاظ سے بھی اقبال اور اثر کی شاعری میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ اثر کی شاعری میں رنگا رنگ تشبیہات اور خوبصورت علائم و استعارے پائے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی وہ اقبال کے معاصرین میں ایک نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ بھی اقبال کی طرح اپنے خیالات تشبیہات و استعارات کے ذریعے سے کچھ اس طرح موڑ دیتے ہیں کہ ایک انوکھی فضا تعمیر ہوتی ہے۔ حسن و عشق کے جذبات ہوں یا فلسفیانہ افکار، فطرت کی سحر کاری ہو یا کوئی اور جذبہ، اثر برابر نئی نئی تشبیہوں اور استعاروں کی کھوج میں رہتے ہیں اور خیالات کو دلکش بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔ ظاہر ہے کہ سوچنے سمجھنے اور خیالات کو اس طرح سے برتنے کا فن انہوں نے اپنے مرشدِ فن اقبال سے ہی سیکھا ہے۔ کیونکہ اقبال کی شاعری میں یہ اسلوب بہت نمایاں ہے۔ اثر کے ہاں بھی اقبال کے معاصرین کی طرح بڑی دلنواز تراکیب دیکھنے میں آتی ہیں۔ ان تراکیب کے استعمال سے ان کی شاعری ایک نئے اُفق میں داخل ہوتی ہے اور نئے نئے مفاہیم کے ساتھ ساتھ نئی جہتیں بھی اُجاگر کرتی ہے۔ اثر نے اقبال کی طرح بکھرے ہوئے الفاظ کو ایک دوسرے سے ملا کر ایک زبردست رشتہ پیدا کیا ہے۔ اس طرح سے اُنہوں نے اپنے ذہنِ رسا کے ذریعہ سے سوتے ہوئے لفظوں کو حرکت و حرارت دی ہے۔ •

• ماہنامہ شیرازہ، سرینگر شمارہ ۴، ۵، جلد ۳۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

قتیل شفائی کے گیت

قتیل شفائی ایک منفرد شاعر ہیں۔ انھوں نے غزل اور نظم کے علاوہ گیت بھی تخلیق کئے ہیں۔ شعر و شاعری کی ان تمام اصناف میں اُن کی رنگا رنگ شخصیت نمایاں طور پر جھلکتی ہے۔ اُن کا لب و لہجہ صاف ستھرا اور سلجھا ہوا ہے۔ اسی لئے اُن کی شاعری خصوصاً اُن کے گیت بہت مقبول ہیں۔ قتیل شفائی نے اس زمانے میں اپنی شاعری کا آغاز کیا جب شاعرِ رومان اختر شیرانی کی رومانی نظموں کا بول بالا تھا اور اُن کی نظموں کا کردار سلمیٰ اس زمانے میں توجہ کا مرکز بن چکا تھا۔ رومانی نظموں کی یہی کیفیت قتیل کے ذہن و دل پر حاوی رہی اور اسی لطافت اور حسن نے اُن کی شاعری کو جنم دیا۔ وہ جہاں اقبال، جوش اور فراق کی شاعری سے خاص طور پر متاثر ہیں وہاں انھوں نے اختر شیرانی، احمد ندیم قاسمی اور ن م راشد کا اثر بھی داخلی طور پر قبول کر لیا چنانچہ ایک جگہ خود رقمطراز ہیں:

> "اقبال، جوش، فراق، اختر شیرانی، احمد ندیم قاسمی، ن م راشد نے مجھے بے حد متاثر کیا۔"[۱]

قتیل نے اپنی شاعری میں کئی نئے تجربے کئے ہیں۔ یہ تجربے اُن کے گہرے مشاہدات اور داخلی اور خارجی واقعات پر مبنی ہیں اور پھر اُن کی رنگ آمیزی اور اُن کا مصورانہ رجحان بھی اُن کے اشعار میں ڈھل کر شبنم سے ڈھلے ہوئے صبح نو کی طرح آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتے ہیں۔ قتیل کی شاعرانہ عظمت کے بارے میں نریش کمار شاد تحریر فرماتے ہیں:-

> "اُن کی مقبولیت کا راز اُن کے لب لہجہ کی شیرینی اور گہری رومانیت میں مضمر ہے۔ اس رومانیت کا اکتساب انھوں نے احمد ندیم قاسمی کے

۱۔ نریش کمار شاد۔ پانچ مقبول شاعر اور اُن کی شاعری۔ ص ۴۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اثرات سے کیا ہے۔ لیکن اپنے انفرادی تجربوں اور ذاتی کاوشوں کی رنگ آمیزی سے ان اثرات کو نیا حسن اور نئی زندگی عطا کی ہے"۔ [1]

قتیل ایک کامیاب گیت کار ہیں۔ ان کے گیتوں میں تازگی مٹھاس اور البیلا پن ہے۔ ان میں جہاں ایک طرف رقص و موسیقی کا ایک حسین منظر جلوہ گر ہوتا ہے، وہاں دوسری طرف یہ گیت کیف و سرمستی سے سرشار ہیں۔ قتیل نے انوکھے اسٹائل سے اپنے گیتوں میں نغمگی اور حسن پیدا کر دیا ہے۔ اس نغمگی سے قاری کے ہونٹ خود بہ خود رقص کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ گیت نگاری میں قتیل کی آواز کوئی نئی آواز نہیں بے شمار شعرا نے اچھے گیت تخلیق کئے ہیں لیکن قتیل نے عام روش سے ہٹ کر چند نئے تجربے کئے ہیں جن میں ایک نیا اور انوکھا تجربہ ان کے گیتوں میں تال اور سرگم کا ہے۔ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی تحریر فرماتے ہیں:۔

"قتیل کے یہاں پنجاب کا صحت مند رومان ہے اور اُن کی وہی نظمیں ان کی انفرادیت متعین کرتی ہیں جن کا تعلق عشقیہ جذبات سے ہے یا عورت کی زندگی کے کسی روپ کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری ہلکی پھلکی غنائی شاعری ہے اور اُن کے مزاج کو گیتوں سے بہت مناسبت معلوم ہوتی ہے"۔ [2]

قتیل کے مندرجہ ذیل گیتوں میں بے قراری، محبوب کی یاد، ہجر و وصال کی کیفیت، چپ چپ کے آنسو بہانے اور اپنے رازِ دل کو ان آنسوؤں میں چھپانے کے جذبات اپنے پورے شد و مد کے ساتھ اُبھرتے ہیں۔

بیتے برس میں جتنی چاندنی راتیں ہیں
بکھری ہوئی ان سب میں اپنی باتیں ہیں
تجھ سے مل کر پریت مری لہرائی تھی
بے سُدھ ہو کر میں کنگنا کھنکاتی تھی
چپ چپ سے رہتے ہیں اب کنگنا میرے
شام سویرے ——— او سجنا

[1]۔ نریش کمار شاد، پانچ مقبول شاعر اور انکی شاعری ص ۶۰ [2]۔ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی، اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ص ۱۹۸

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ذرا تم جھانک کر دیکھو کہ باہر کی فضا کیا ہے
جہاں بھی کوئی منظر ہے وہاں اک حشر برپا ہے
ذرا سی دیر میں جب یہ گھڑی بھی لوٹ جائے گی
نہ ہم کو نیند آئے گی نہ تم کو نیند آئے گی

●

گوری پیچ بجار ناچے
من ہی من میں تڑپے پھر بھی کہ کے سنگار ناچے
گوری پیچ بجار ناچے

قتیل شفائی کے ان گیتوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں تغنیت اور نغمگی کا ایک متوالا انداز ملتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا قتیل کے گیتوں میں اس کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"قتیل شفائی کے گیتوں کا امتیازی وصف ان کی نغمگی اور جھنکار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رقص اور گیت کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور گیت کی لے میں رقص کرتے ہوئے قدموں کی جھنکار بھی شامل ہوتی ہے۔ لیکن جس طرح رقص کی جھنکار نے قتیل شفائی کے گیتوں کا احاطہ کیا ہے اس کی مثال عام طور سے ناپید ہے"۔ [۱]

قتیل کے گیتوں میں منظر کشی کا بسیط اور پھیلا ہوا رجحان ملتا ہے۔ اور یہی ایک کامیاب گیت کار کی ضمانت ہے۔ وہ اپنے گیتوں میں خوبصورت اور زیادہ سے زیادہ دلکش مناظر پیش کرنے کے روادار ہیں۔ اس طریقہ کار کو اپنانے سے انھوں نے قاری کا دل موہ لیا ہے قتیل نے فضا سازی کا یہ رجحان اپنا کر اپنے گیتوں کا رنگ اور بھی تیکھا کر دیا ہے۔ وہ اپنے جذبات کو بڑے انوکھے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے گیتوں میں ان تین چیزوں کا خاص طور پر احساس ہوتا ہے۔

۱۔ تمہید، ۲۔ مرکزی خیال، ۳۔ اختتامیہ

قتیل شفائی کے گیتوں میں کبھی پگھلتی ہوئی چاندنی، فضاؤں میں نمودار ہوتی ہے

---

[۱] ڈاکٹر وزیر آغا: اردو شاعری کا مزاج، ص ۲۳۱-۲۳۰

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اور کبھی ہواؤں میں تیرتی ہوئی بے چینیاں محسوس ہوتی ہیں۔ کبھی پربت کے دامن سے آہستہ آہستہ چاند ظاہر ہونے لگتا ہے۔ کبھی سورج کی سنہری کرنیں سارے عالم کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہیں۔ کبھی بھیگی راتوں میں تن بدن کی آگ خود بہ خود بجھ جاتی ہے اور کبھی پہاڑوں اور جھرنوں کے پر بہار مناظر سامنے آجاتے ہیں۔ یہ کیفیت قتیل کے گیتوں میں جگہ جگہ ملتی ہے۔ مثلاً

قدرت نے کیا رنگ دکھایا
دکھیا کے گھر دکھ آیا
اک دوجے سے مانگ رہے ہیں خوشیوں کی خیرات
دیا جلے ساری رات

•

بکھر جائے گی جب پگھلی ہوئی چاندی فضاؤں میں
تو کچھ بے چینیاں سی تیر جائیں گی ہواؤں میں
یہ کیف ہر اک سوئی تمنا کو جگائے گی
نہ ہم کو نیند آئے گی نہ تم کو نیند آئے گی

•

جیسے شبنم پہ تھرکتی ہوئی سورج کی کرن
آج پھر جھوم رہا ہے میرا من
کوئی تصویر خیالوں میں نظر آتی ہے
پاس کوئی نہیں آواز مگر آتی ہے
چاپ قدموں کی بنی جاتی ہے دل کی دھڑکن
آج پھر جھوم رہا ہے میرا من
میرے مچلے ہوئے خوابوں کا مہکتا ہے چمن
آج پھر جھوم رہا ہے میرا من

•

قتیل کے گیتوں کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُن کے گیت پیکروں میں ڈھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ ان پیکروں کے استعمال سے ان کے گیتوں میں محاکاتی عمل پیدا ہو گیا ہے مثلاً انھوں نے چاندنی راتیں، بے سدھ، ہرجائی پن، رسیلی چاندنی، پربت کا دامن، برہن کے ساتھ تاج اگن کا، آنسوؤں کی سوغات، آس کی جگنو، بھیگی پلکیں، آشا کی کلیاں وغیرہ جیسے الفاظ اور پیکر استعمال کرکے اِن گیتوں میں ایک نئی رُوح پھونک دی ہے۔ اُن کے گیتوں کا تاثر کافی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

دیر تک دل و دماغ پر حاوی رہتا ہے۔ قتیل شفائی نے نئے نئے الفاظ کو شعری قالب میں ڈھال کر اپنے گیتوں میں ایک نئی دنیا بسائی ہے۔ اُن کا تخیل اُن کے گیتوں میں ڈھل کر مجرد تصوّرات کی شبیہہ سازی کے اعلیٰ نمونے پیش کرتا ہے۔ اُن کے گیتوں میں جذبات نگاری بھی ملتی ہے اور کیف و سرمستی بھی۔ قتیل کے ہاں نرم اور ملائم ہندی آمیز الفاظ کے ساتھ ساتھ فارسی کے الفاظ اور تراکیب بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ حامدی کاشمیری، قتیل کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

"قتیل شفائی کے اسلوب میں بہر کیف انفرادیت کے نشان ملتے ہیں وہ لفظوں اور ترکیبوں کی چھپی ہوئی معنویت کا شعور رکھتے ہیں۔" ۱

اس بیان سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ قتیل کے کلام میں جہاں گہرائی ہے وہاں ان کے ہاں گیرائی بھی ملتی ہے۔ اُن کے گیتوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان میں انفرادیت کے نشانات واضح طور پر نظر آتے ہیں مثلاً۔

وہ دیکھو چاند بھی پربت کے دامن سے نکل آیا
بہت پچھتاؤ گے ایسے میں گر ماتھے پہ بل آیا
الگ رہنے سے دونوں کو یہ تنہائی ستائے گی
نہ ہم کو نیند آئے گی نہ تم کو نیند آئے گی

●

بھولنے والے یاد تجھے میں کرتی ہوں
پر تیرے ہرجائی پن سے ڈرتی ہوں
الٹا تو الزام نہ مجھ پر دھرتا ہو
یاروں میں مجھ کو بدنام نہ کرتا ہو
میں نے تو سکھیوں میں گائے گن تیرے
شام سویرے ــــ او سجنا

●

میرے مچلے ہوئے خوابوں کا لہکتا ہے چمن
آج پھر جھوم رہا ہے میرا من
کھو گئی پیار کی ٹھنڈک میں جدائی کی جلن
آج پھر جھوم رہا ہے میرا من

۱۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری: جدید اردو نظم اور یورپی اثرات ص [illegible]

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

میرے شانوں پہ ہے بکھری ہوئی زلفوں کی گھٹا
جانے کیا کہتی ہے مجھ سے تیرے آنچل کی ہوا
اپنے ہی سائے سے شرمانے لگا میرا بدن
آج پھر جھوم رہا ہے میرا من

قتیل شفائی کے گیتوں کی انفرادیت اسی میں ہے کہ ان کے ہاں ارضی تشبیہات اور استعارات کا کثیر تعداد میں استعمال ملتا ہے۔ ان کے استعمال سے اُن کے گیتوں میں تڑپ اور گداختگی پیدا ہو گئی ہے۔ شکیل بدایونی، مجروح سلطانپوری، ساحر لدھیانوی، منیر نیازی، تنویر نقوی، تاج سعید، جمیل الدین عالی اور ناصر شہزاد وغیرہ جیسے گیت کاروں نے جہاں ایک طرف پرانی تشبیہات اور استعارات کو نئے معنوں میں استعمال کر کے گیت نگاری کا فن بام عروج پر پہنچایا ہے وہاں قتیل نے بھی اپنی انوکھی تشبیہات اور استعارات سے اس فن کو مستحکم بنانے میں اپنا حصہ ادا کیا۔ جہاں تک قتیل کے گیتوں میں اس عمل کا دخل ہے۔ ان کے ابتدائی گیتوں میں روایتی تشبیہات اور استعارات ملتے ہیں لیکن ان کے نئے گیت بڑے معنی خیز ہیں۔ ان میں نیا اور انوکھا پن ملتا ہے۔ قتیل روایت سے بغاوت بھی نہیں کرتے ہیں اور عصری حسیت سے منہ کبھی نہیں موڑتے ہیں۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ ان کی شاعری روایتی اور عصری خیالات کا سنگم ہے تو بے جا نہیں ہوگا۔

قتیل کے گیتوں میں رنگا رنگ تشبیہات، انوکھے استعارات اور نرم اور رسبک الفاظ ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں تغزل اور موسیقیت کا عنصر ہر جگہ غالب ہے۔ چند گیت پیش خدمت ہیں:۔

سوامی سمجھے گھونگھٹ پیچھے ہوگا چاند کا ٹکڑا
گھونگھٹ کے پٹ کھلے تو نکلا مرجھایا سا مکھڑا
ڈھانپ کے رُوئے مرجھائے سے مکھڑے کو البیلی
دلہن نئی نویلی

●

کیوں بنسی کوئی بجاتا ہے
اب نا ناں اگر کوئی گونجے گی میں موت کا راگ سناؤں گی
بنسی نہ اگر خاموش ہوئی میں تڑپ تڑپ مر جاؤں گی
بیتے دن یاد دلاتا ہے
کیوں بنسی کوئی بجاتا ہے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تیرا میرا دل دھڑکن کا ناتا تھا
میں نہ ملوں تو چین تجھے کب آتا تھا
یاد تو ہوں گے پیار بھرے وہ دن تجھ کو
دنیا سونی لگتی تھی مجھ بن تجھ کو
کرتا رہا تو میری گلیوں کے پھیرے
شام سویرے — او سجنا

قتیل شفائی کی گیت نگاری کا بنیادی وصف ان کی زبان کی تازگی اور مٹھاس ہے۔ اس زبان کے استعمال سے ان کے گیتوں میں ایک نئی کیفیت اُجاگر ہوتی ہے۔ قتیل اُردو زبان کے ساتھ ہی ساتھ ہندی کے میٹھے اور رس دار الفاظ کو بھی خاطر میں لاتے ہیں۔ ان کے گیتوں میں اس زبان کے استعمال سے ایک نئی فضا کا احساس ہوتا ہے۔ زبان و بیان کے استعمال کا یہ طریقہ کار قتیل شفائی کا ایک اہم وصف ہے۔ اور یہ کیفیت ان کو اپنے ہم عصروں میں منفرد اور ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ مثلاً ان کے گیتوں میں افلاک قاعدہ، صلہ، انگشت، بدنداں، ایاغ، ضوفگن، مغموم، طاق، خس و خاشاک، نم آلودہ، عجز، عروس زندگی آبدیدہ، انبوہ غنضیر جیسے الفاظ کے ساتھ ساتھ دیا، نیر، برہن، اگن، اندھیالے، دکھیا، دوجے، بابی، نین، دیپک، موہے، آشا، بات، چھمک جھن جھن، گوری، بوند، پل، سجنا، برس، پریت، کنگنا، سکھیوں وغیرہ جیسے ہندی کے نرم اور رسیک الفاظ کا استعمال ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ قتیل کے گیتوں میں الفاظ کا یہ خوبصورت استعمال قابل غور ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:۔

نسیم سحر نے مجھے گدگدایا۔ ہنسا کر یہ مجھ کو بتایا۔ کہ وہ آ گئے ہیں
چہکتے ہوئے پنچھیوں نے جگایا۔ جگا کر یہ مجھ کو بتایا۔ کہ وہ آ گئے ہیں
مہکنے لگا پھر گلابی، سویرا
ملا مجھ سے بچھڑا ہوا پیار میرا
محبت بھرا گیت بھنوروں نے گایا۔ لبھایا۔ لبھا کر یہ مجھ کو بتایا کہ وہ آ گئے ہیں

•

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

نئیں جو اُنگڑائیاں تو دل میں کئی ہوک اُٹھے

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

میری ہر سانس میں کوئل سی مدھر کوک اٹھے
کیا اسی چیز کو کہتے ہیں محبت کی لگن
آج پھر جھوم رہا ہے میرا من

●

کیوں ہنسی کوئی سجاتا ہے
برگد کے گھنیرے سائے میں جب گونجے گی آواز کوئی
میں جان پہ کھیل تو جاؤں گی پر کھل جائے گا راز کوئی
بدنامی سے دل گھبراتا ہے
کیوں ہنسی کوئی سجاتا ہے

قتیل شفائی کے گیتوں کا بنیادی موضوع عورت کی نفسیات ہے۔ وہ عورت کو ہر زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کے روادار ہیں۔ ان کے خیال میں عورت دنیا میں سب سے انوکھی شئے ہے اور اس شئے کو سنوارنا اور سجانا مرد کا کام ہے۔ ان کے مطابق مرد میں ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ عورت کو صرف جنسی زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ عورت صرف جنس اور طوائف کا ایک پیکر ہی نہیں بلکہ محبت، پیار اور خلوص کا ایک نادر نمونہ ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اپنی کتاب میں قتیل کے گیتوں میں اس جذبے کی طرف متوجہ کراتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"قتیل کے گیت میں عورت اس پنچھی کی طرح ابھری ہے۔ جسے تازہ تازہ پر عطا ہوئے ہوں اور جو ابھی اڑنے کے قابل تو نہ ہوئی ہو۔ تاہم جس کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ نے نغمے میں ایک انوکھی جھنکار کا اضافہ ضرور کر دیا ہو۔" [ا]

قتیل عورت کی سماج میں ہر طرح ترجمانی اور وکالت کرتے ہیں۔ عورت کے سسرال کا ظلم و ستم ہو یا میکے کی طرف مراجعت، اس کے خاوند سے بدگمانیاں ہوں یا بازار میں عورت کے نیلام ہونے کا منظر، روٹھی اور گھر کے کونے میں سہمی سہمی عورت کی تصویر کشی ہو یا میرا کی طرح سنسار تیاگ کرکے کرشن پجارن۔ قتیل جیسے شاعر

ا۔ ڈاکٹر وزیر آغا، اردو شاعری کا مزاج، ص ۲۳۱-۲۳۰۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کا قلم برابر چلتا رہتا ہے۔ ان تمام جذبات کو قتیل نے اپنی شاعری خصوصاً اپنے گیت میں جگہ دی ہے اور اس میں وہ بے حد کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس کو اُن کا انوکھا طرزِ عمل کہئیے یا اُن کے ذاتی مشاہدات اور تجربات کا ردِ عمل بات برابر آگے بڑھتی ہے۔

قتیل شفائی کے گیت عشقیہ جذبات سے سرشار ہیں۔ ان میں رومان اور سیکس کی بے شمار جھلکیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ اُن کے گیتوں میں نہ صرف عاشق اور محبوب کے شوخ جذبات ہی دیکھنے میں آتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ طنزیہ لب و لہجہ بھی ملتا ہے۔ وہ آج کل کے سماج، حکومت اور موجودہ دَور کے انسان کو طنز کا نشانہ بنا دیتے ہیں۔ قتیل شفائی کو اپنے وطن پنجاب سے والہانہ عقیدت ہے۔ اسی لئے ان کے گیتوں میں پنجاب ہی کی فضا اور اس کے ماحول کا البیلا پن جلوہ گر ہوتا ہے۔ قتیل نئی نسل کا شاعر نہیں ہے لیکن ان کے نغمے سدا بہار ہیں۔ ان میں ایک عجیب البیلا پن ایک عجیب مستانہ روی اور نیا پن ہے جو دلوں میں بے نام درد کی ٹیس جگاتا ہے۔ قتیل کی شاعری اپنے اچھوتے اور کنوارے اسلوب اور موضوع کے برتاؤ کی وجہ سے کافی دنوں تک زندہ رہے گی۔

'فن اور شخصیت' ممبئی
قتیل شفائی نمبر
شمارہ نمبر ۱۳-۱۴-
ستمبر ۸۱ء، مارچ ۸۲ء

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بُلبُل کاشمیری ـــ شخص اور شاعر

ریاست جموں و کشمیر سے تعلق رکھنے والے بیسیوں خاندان ایسے ہیں جو تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہیں آباد ہوئے۔ ان خاندانوں میں بعض ایسے مشاہیر پیدا ہوگئے جنہوں نے اپنی غیر معمولی صلاحیت سے اردو شعر و ادب میں نمایاں مقام پیدا کیا۔ ان مشاہیر میں قدرت اللہ شہاب، چراغ حسن حسرت، اللہ رکھا ساغر، رفیق خاور، میر عبدالعزیز، خواجہ عبدالصمد وانی، طاؤس بانہالی، لطیف کاشمیری، حبیب کیفوی، احمد شمیم، کیف اسرائیلی، قیس شیرانی، عزیز کاشس، امین حزین، اثر صہبائی، محمود ہاشمی، رشید امجد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بلبل کاشمیری ایسے ہی فنکاروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

بلبل کاشمیری وادیٔ کشمیر کے ایک معروف انشاپرداز، ایک با صلاحیت ادیب اور قابل ذکر شاعر ہیں۔ وہ طنز و مزاح کے میدان سے گہرا شغف رکھتے ہیں اور نظم کے وسیلے سے رنگا رنگ پھول کھلا رہے ہیں۔ یہ بات باعث طمانیت اس لئے بھی ہے کہ وہ اُردو کی بستی سے دُور لندن میں رہائش کرتے ہیں اور شعر کے میڈیم سے ادب کی بے لوث خدمت کرتے ہیں۔

بلبل کاشمیری کا خاندانی نام شیخ غلام علی ہے۔ وہ ۱۶۔۱۶ اپریل ۱۹۲۲ء کو کشمیر کے ایک دُور دراز گاؤں آجر (بانڈی پورہ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مڈل اسکول بانڈی پورہ میں حاصل کی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول سوپور سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے انھوں نے سری پرتاپ کالج سرینگر میں داخلہ لیا۔ اور ۱۹۳۷ء میں بی اے کا امتحان امتیاز سے کامیاب کیا۔ کالج سے فارغ ہونے کے بعد بلبل محکمہ تعلیم میں مدرس ہوگئے اور وادی کے اطراف و اکناف میں اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیتے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

رہے۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۱ء تک وہ بلتستان کے کرگل اور اسکردو کے اسکولوں میں پڑھاتے رہے۔ بلبل تعلیم کے پیشے سے متنفر تھے۔ اپنے عزیز دوست اور کشمیری زبان کے معروف شاعر غلام محمد عارض (مرحوم) کے نام اپنے دل کے جذبات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"میرا مستقبل ٹیچری پر ختم ہے۔ میں کہاں ہوتا اور کیا ہوتا۔ مگر اف بدقسمتیوں نے گھیر کر رکھ دیا ہے۔ تیرہ بختی بجلی کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑی۔ اب چاہتا ہوں کہ حسین موت ہی اب میرے عیوب برہنگی کو چھپا دے۔ میرے دل کے تمام ارمان اب سو گئے ہیں۔ تمنائیں ماند پڑ گئیں۔" ؎

بلبل ۱۹۴۲ء میں انڈین آرمی میں بھرتی ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک تقسیم ہوا تو وہ پاکستان آرمی میں ملازم ہوئے جہاں مختلف محاذوں پر لڑتے رہے۔ سالہا سال تک بلبل توپوں اور بندوقوں سے کھیلتے رہے لیکن انھوں نے کبھی بھی قلم کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ انھوں نے فیض اور ضمیر جعفری کی طرح مشق سخن جاری رکھی اور اپنے لئے مخصوص مقام بنایا۔ فوج میں برسوں تک اپنے فرائض انجام دینے کے بعد وہ کچھ عرصہ پہلے ریٹائر ہو گئے۔ اور اب لندن میں مستقل طور پر مقیم ہیں۔

بلبل کاشمیری شروع سے ہی پڑھنے لکھنے سے شغف رکھتے تھے۔ انھوں نے ابتدا سے ہی شعر کہنا شروع کئے۔ اُس زمانے میں سری پرتاپ کالج سرینگر ریاست میں ادبی مجالس کا مرکز تھا۔ کشمیر کے اکثر فن کار کالج کے انہی مجالس سے فیض حاصل کر چکے ہیں۔ ریاست کے بعض معروف قلم کاروں نے اسی کالج کے میگزین "پرتاپ" سے اپنا ادبی سفر شروع کیا اور بقول پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم) "رسالے میں لکھنے والے طلباء میں سے کئی اس زمانے کے اچھے انشاپرداز اور شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔" ؎

بلبل شروع سے ہی ذہین تھے۔ کالج کے زمانے میں ہی وہ اپنی شاعری اور انشا پردازی کا لوہا منوا چکے تھے۔ اپنی اسی بے پناہ صلاحیت کی وجہ سے وہ کالج میگزین پرتاپ کے حصہ اُردو کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ انھوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت سے بے حد مقبولیت حاصل کی۔ اُن کے ہم عصر اور لنگوٹیے یار جناب غلام محمد میر طاؤس اپنے شعری مجموعے "موج موج

لہ۔ بلبل کاشمیری کا ایک خط راقم السطور کے نام۔ راقم بلبل کے اس خط کے لئے میں کشمیری زبان کے معروف ادیب اور شاعر جناب موتی لال ساقی کا شکر گزار ہوں۔ ؎ بلبل کاشمیری کا ایک خط راقم السطور کے نام۔ پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم) کشمیر میں اردو، تیسرا حصہ، ص ۱۲۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation Chandigarh. Funding by IKS-MoE 2025 Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کے پیش لفظ میں بلبل کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

"جن دنوں میں کالج میں پڑھتا تھا۔ بلبل (شیخ غلام علی بلبل) ہم کا اُس وقت کا ایک اعلیٰ پائے کا ادیب اور شاعر بھی اسی کالج میں زیر تعلیم تھا۔ بلبل مجھ سے دو سال آگے تھا۔ شگفتہ انشا پردازی اور شوخ مزاح نگاری کے لئے کالج سے باہر کے علمی اور ادبی حلقوں میں خاصی مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔" ؎

غلام محمد طاؤس سے بلبل کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ وہ بھی اچھے انشا پرداز اور شاعر تھے نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ دونوں کشمیر کے معروف شاعر جناب میر غلام رسول نازکی کی صحبت سے اکثر فیض یاب ہوا کرتے تھے جو اُن کو مشورہ بھی دیا کرتے تھے۔ اور شعر کے رموز سے آشنا بھی کرتے تھے۔ نازکی صاحب نے اپنے ان دونوں شاگردوں کو اقبال کے ایک شعر سے ایک دن استقبال کیا۔ یہی شعر بعد میں اُن کے تخلص کا باعث بن گیا۔ شعر ملاحظہ ہو:-

کہ بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

بلبل اپنے شعری مجموعے کے پیش لفظ میں اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"جناب غلام محمد (جو آگے چل کر کمشنر اور ہوم سکریٹری ہوئے) شاعری میں ہمارے سب سے بڑے حریف اور زندگی میں عزیز ترین دوست تھے۔ ہم دونوں نے کالج میگزین کو اپنی مشق سخن کے لئے تختۂ مشق بنا رکھا تھا۔ ادبی حلقوں میں میر غلام رسول نازکی کا بڑا شہرہ تھا۔ ہم دونوں اکثر ان کی صحبت سے فیضیاب ہوا کرتے۔ ایک روز ہم پہنچے تو نازکی صاحب نے علامہ اقبال کے اس شعر سے ہمارا استقبال کیا:-

کہ بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

؎ موج موج (شعری مجموعہ) از غلام محمد میر طاؤس، ص ۱۲۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

"اُس روز سے ہم بلبل ہو گئے اور غلام محمد صاحب طاؤس"[1]

بلبل کاشمیری نے شاعری کا آغاز رواں صدی کے تیسرے عشرے[2] کے آخر سے کیا۔ اُس زمانے میں ریاست کے شعری اُفق پر شعرا کا ایک قافلہ رواں دواں ہو چکا تھا۔ جن ڈاکٹر محمد دین تاثیر، برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی، علامہ عابل دردیش، مرزا کمال الدین شیدا، طالب کاشمیری، شہہ زور کاشمیری، تنہا انصاری، مست کاشمیری، فطرت کاشمیری، رساجاودانی، کشن سمیلپوری، عشرت کاشمیری وغیرہ قابل ذکر ہیں لیکن ان تمام شعرا میں سے میر غلام رسول نازکی کی آواز دُور سے پہچانی جاتی تھی۔ ایسے میں ایک نووارد شاعر بلبل کاشمیری سامنے آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ادبی محفلوں میں اپنی ساخت قائم کرنے لگے۔ ابتدائی کلام میر غلام رسول نازکی کو دکھایا لیکن جلد ہی اپنے کلام کے بال و پر خود ہی سنوارنے لگے۔ 'خندۂ گل' کے دیباچے میں خود رقمطراز ہیں:۔

"میر غلام رسول نازکی کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ وہ ہماری اوّلین درس گاہ میں ہمارے استاد تھے۔ اُن کے علم و فضل کا شہرہ تو عام تھا مگر ہم پر اُن کی نگاہ شفقت خاص تھی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بلبل کی شاعری نے انہی کی حوصلہ افزائی سے بال و پر نکالے تھے۔"[3]

ذیل کے اشعار اُن کے کالج کے دنوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ یہ اشعار انھوں نے بطور خاص لندن سے مجھے بھیجتے ہیں۔

امتحانوں میں تیاری کی ہمیں عادت نہیں
امتحان کے ہال میں الہام ہونا چاہیئے

تجھے کیوں دختر رز سے عداوت ہو گئی زاہد
مجھے وہ اس زمانے کی دلی معلوم ہوتی ہے

کالج سے فارغ ہونے کے موقعہ پر بلبل نے ایک طویل نظم کہی تھی جس کا مطلع ہے:۔

اے معزز اوستاد و لیکچرار الوداع
آسمان علم کے روشن ستارو الوداع

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ بلبل کو میر غلام رسول نازکی کے ساتھ گہرے مراسم رہے ہے

۱، ۲، ۳ خندۂ گل (شعری مجموعہ) از بلبل کاشمیری ص ۹-۱۰، ۱۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہیں۔ وہ اُن کے دوست بھی ہیں اور رہنما بھی۔ نازکی صاحب نے بلبل کے نام ایک منظوم خط بھی لکھا ہے[1] جو قابلِ مطالعہ ہے۔ اس میں وہ بلبل سے شکوہ کرتے ہیں، چنانچہ اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:۔

مجھ سے کیا تقصیر سرزد ہو گئی — بندہ پرور ظلم کی حد ہو گئی
ڈاکیے کا راستہ کب تک تکوں — تو ہی کہہ میں صبر کتنا کر سکوں
- - - - - - - -
نازکی چشم نثارِ بلبل است — حیف بلبل کشتۂ نازِ گل است

بلبل کا ابتدائی کلام دستیاب نہیں۔ وہ ایک شعری مجموعہ لبِ شیریں کے نام سے ترتیب دے چکے تھے، جو بد قسمتی سے کسی شخص نے چُرا لیا۔ یہ مجموعہ ۱۴۰ صفحات پر مشتمل تھا لیکن اس کی اشاعت میں انھوں نے تامل سے کام لیا۔ خندۂ گل کے دیباچہ میں لکھتے ہیں "اسی تامل اور تذبذب میں ہم اپنے کلام کا ایک حصّہ کھو بیٹھے"۔ اپنی نظم بیاض چوری ہو جانے پر میں اس کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔ نظم کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

شاعرِ رنگیں تو اک گھر لٹا پھر وقتِ شام
چودھویں تاریخ ملتی تھی روزوں کے دن ماہِ صیام
لُٹ گئی سب دولتِ شعر و سخن ساماں کے ساتھ
وہ بیاضِ شعر تھی جس کا لبِ شیریں تھا نام
مشتمل تھی ایک سو چالیس صفحوں پر بیاض
غیر مطبوعہ ابھی تک تھا وہ دوشیزہ کلام

---

[1] پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم) اپنی کتاب کشمیر میں اردو (تیسرا حصّہ) سنہ اشاعت ۱۹۸۴ء ص ۴۴ میں لکھتے ہیں کہ بلبل نے ایک منظوم خط میر غلام رسول نازکی کے نام لکھا تھا جن سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ اس کے ابتدائی دو شعر اور آخری شعر درج ذیل ہے۔

مجھ سے کیا تقصیر سرزد ہو گئی — بندہ پرور ظلم کی حد ہو گئی
ڈاکیے کا راستہ کب تک تکوں — تو ہی کہہ میں صبر کتنا کر سکوں
نازکی چشم نثارِ بلبل است — حیف بلبل کشتۂ نازِ گل است"

سروری صاحب کا یہ بیان درست نہیں ہے۔ دراصل یہ منظوم خط نازکی صاحب نے بلبل کے نام لکھا تھا۔ میرے ایک استفسار کے جواب میں بلبل صاحب اس کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔
"مندرجہ ذیل اشعار میر غلام رسول نازکی نے میرے نام لکھے تھے (یہ میرے اشعار نہیں ہیں)۔
مجھ سے کیا تقصیر سرزد ہو گئی — بندہ پرور ظلم کی حد ہو گئی — نازکی دیدم نثارِ بلبل است — حیف بلبل کشتۂ نازِ گل است"
[illegible] ۱۱ مارچ ۱۹۹۶ [illegible]

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بلبل کاشمیری کا ایک شعری مجموعہ خندہ گل کے نام سے ۱۹۸۷ء میں ادارہ فروغ اردو لاہور نے بڑے اہتمام کیساتھ شائع کیا ہے۔ کشمیر کے مناظر سے متعلق اُن کی سنجیدہ نظموں کا مجموعہ 'دستِ حنا' کبھی چھپ چکا ہے۔ اُن کا ایک اور مجموعہ شیر و شکر[1] عنقریب ہی زیورِ طبع سے آراستہ ہو رہا ہے جو اُن کے مزاحیہ کلام پر مشتمل ہے۔ بلبل اپنی مزاح نگاری سے اس افسردہ دنیا میں ہنسی تقسیم کر رہے ہیں اور یہی اُن کا منظر یہ شعر ہے۔[2]

'خندہ گل' بلبل کی مزاحیہ و طنزیہ شاعری کا مجموعہ ہے۔ اس کا پیش لفظ "بلبل شیریں مقال" کے عنوان سے معروف شاعر و طنز نگار سید ضمیر جعفری نے لکھا ہے۔ انھوں نے اپنے پُر مغز پیش لفظ میں بلبل کی شخصیت اور شاعری پر بھر پور روشنی ڈالی ہے لیکن وہ خندہ گل کو بلبل کی مزاحیہ نظموں کا پہلا مجموعہ قرار دیتے ہیں[3] جبکہ اس مجموعے میں مزاحیہ نظموں کے علاوہ موضوعاتی مزاحیہ غزلیں، قطعات، تضمینیں اور متفرق اشعار سب کچھ شامل ہے۔ بلبل مجموعے کا آغاز ایک دعائیہ نظم سے کرتے ہیں۔ اس کے بعد نظموں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ بلبل کی مزاحیہ نظمیں ہیں جن کو انھوں نے "گوشۂ فرنگ" "زنگا رنگ" کے عنوان سے مجموعے میں شامل کیا ہے۔ ان نظموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ گوشۂ فرنگ، ۲۔ رنگا رنگ

یہ دو عنوانات مغرب و مشرق کی علامتیں ہیں۔

گوشۂ فرنگ میں بلبل نے لندن کی فضاؤں سے متاثر ہو کر نظمیں شامل کی ہیں۔ لندن کے لوگوں کا رہن سہن، وہاں کا کلچر، تہذیب، تمدن، مشہور بازاروں اور دلکش مقامات کا ذکر، لندن میں مستقل طور پر قیام کرنے والے غیر ملکی خاص طور پر مشرق سے آئے ہوئے لوگوں کی طرزِ زندگی اور اُن کے مشاغل وغیرہ ان نظموں کے موضوعات ہیں ان میں طنز و مزاح کا بھر پور پہلو اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ اُجاگر ہوتا ہے۔ ان نظموں میں انگلستان میں لندن کی رات، لندن کا مونی بازار، ڈالر مر رہا ہے، شاعر کی وصیت کا لالوگ وغیرہ ذکر کے قابل ہیں۔ نظموں کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:-

آنکھ نیلی، بال نقلی، چست جامہ مست چال
دلبروں کی ہے یہی پہچان انگلستان میں

۱،۲۔ بلبل کاشمیری کا ایک خط راقم السطور کے نام، ۳۔ خندہ گل از بلبل کاشمیری ص ۲۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

آیئے بریڈفورڈ چلتے ہیں سیاحت کے لئے
دیکھ تیں گے آپ پاکستان انگلستان میں

ہے اردو کا تصدق ہو گئے شیر و شکر
آکے پاکستان و ہندوستان انگلستان میں
(انگلستان میں)

گلبا نگ نا و نوش ہے گھر گھر تمام رات
برپا ہے جشن بادہ و ساغر تمام رات
لندن کی رات عشق و جوانی کی رات ہے
بہتا ہے عشرتوں کا سمندر تمام رات

اِک بینک کے سٹاف میں بیوی تمام دن
اِک فیکٹری کے بیچ میں شوہر تمام رات
(لندن کی رات)

سردیوں کی سرد مہری سے ٹھٹھر جاتی ہے دھوپ
لوگ حیران ہیں کہ جاڑے میں کدھر جاتی ہے دھوپ
مسکرا لیتے ہیں وہ گیسو بکھیرے دن کو جب
رات کے تاریک سایوں پر بکھر جاتی ہے دھوپ
شرم سے منہ ڈھانپ لیتی ہے یہ گوری پردہ دار
کون کہتا ہے کہ ان گوروں سے ڈر جاتی ہے دھوپ
(ولایتی دھوپ)

لندن کے گرد و نواح میں سوتھال نام کی ایک بستی ہے۔ یہ بستی دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں کالے لوگوں کی اکثریت ہے۔ گورے لوگ جن کا یہ اصلی مسکن ہے آہستہ آہستہ سے غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ بسمل کی یہ نظم اپنے موضوع کے لحاظ سے اچھی کوشش ہے اس نظم میں کالے اور گورے کے درمیان تضاد اور ٹکراؤ کی کیفیت ملتی ہے لیکن اس بستی میں اپنی اکثریت کی وجہ سے کالے لوگ ہی حاوی ہیں۔ یہ بند ملاحظہ ہو:

؎ سابقہ گورے کبھی سوتھال میں آتے نہیں

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

دال میں کالا ہے کہہ کر دال وہ کھاتے نہیں
دیس کو پردیس کہنے میں وہ شرماتے نہیں
شہرت اُن کی خود اُن کے شہر میں پامال ہے
ہر طرف سوتھال میں سوتحال ہی سوتھال ہے

(سوتھال) ——————

نظموں کے دوسرے حصے "رنگارنگ" میں بندر روڈ پر بس میں، میرا روزہ، دفتر کھلا بیاض چوری ہو جانے پر، اور دیس سے آنے والے تبادغیرہ جیسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں مشرقی تہذیب و تمدن کی بھرپور جھلکیاں پیش کرتی ہیں۔ ان نظموں میں مشرق میں تیزی سے پھیلی ہوئی نئی تہذیب کا ذکر، دفتروں کا حال، کراچی کے نواح میں فوجی چھاؤنی کی مصروفیات اور اپنے مادرِ وطن کشمیر کے تئیں اُن کے والہانہ جذبات اور اس طرح کے رنگارنگ موضوعات پر نظمیں شامل ہیں۔ بلبل کی نظم "بس میں" اپنی نوعیت کی انوکھی کوشش ہے۔ اس نظم میں مزاحیہ انداز میں بلبل نے بسوں میں سواریوں کے بُرے حال پر بھرپور تمسخر اڑایا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

اک اک سیٹ پہ دس دس بس میں — اک دنیا ہے بے بس، بس میں
گھر کا سامان سر پر رکھ کر — تیلی دھوبی ہر کس بس میں
دلی، ڈھاکہ، جہلم، گلگت — بستی بستی کا رس بس میں
کھری ٹن لاری سوٹن کباری — توبہ توبہ بس بس بس میں
بابو پتلے ترچھے ترچھے — تاجر چوڑس چوڑس بس میں
میرے گھٹنے سب کا بستر — کیوں نہ نکلے کھڑکس بس میں
بیگم غمگیں اگلی صف میں — ہو گیا میلا اطلس بس میں
بس ہے یا اک چڑیا گھر ہے — مرغے چوزے سارس بس میں
رونا ان کا دریا دریا — بچوں کا ہے کورس بس میں

بلبل اپنے مادرِ وطن کشمیر سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔ وہ گذشتہ کئی دہائیوں سے غیر ممالک کی خاک چھان رہے ہیں لیکن اپنے مادرِ وطن کو نہیں بھولے۔ اُن کی شاعری میں کشمیر کی جھیلوں، ندی نالوں، آبشاروں اور کھیتوں اور کھلیانوں کی بو باس محسوس کی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

جاتی ہے۔ او دیس سے آنے والے تبا، بلبل کی ایک نمائندہ پیروڑی ہے۔ یہ دراصل شاعر رومان حضرت اختر شیرانی (مرحوم) کی ایک مشہور نظم ہے جس کو بلبل نے اختر شیرانی کی روح سے دست بستہ معذرت کے ساتھ پیروڑی کے رنگ میں ڈھالا ہے۔ بلبل پیروڑی لکھنے میں کمال رکھتے ہیں۔ انھوں نے اقبال، اختر شیرانی، ہری چند اختر اور اکبر الہ آبادی کے بعض مصرعوں پر پیروڑیاں لکھی ہیں۔ پیروڑی اور مزاح نگاری کے لئے بلبل کے ساتھ ساتھ کشمیر کے قاضی غلام محمد بھی نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اُن کی نظم اسلام آباد کا سفر خالص مطالعے کی چیز ہے۔ بلبل بھی طنز کے تیکھے تیر چلاتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اُن کا لہجہ مختلف ہے۔ قاضی غلام محمد نے بے شمار پیروڑیاں لکھی ہیں۔ وہ بھی بلبل کی طرح غالب، اقبال، اختر شیرانی اور ضمیر جعفری سے متاثر ہیں۔ قاضی اور بلبل کے ہاں بعض چیزیں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دونوں ہم وطن اور ہم عصر ہیں۔ دونوں طنز و مزاح کے دلدادہ ہیں دونوں بڑے انوکھے انداز میں پیروڑیاں لکھتے ہیں۔ دونوں خود بڑے سنجیدہ ہیں۔ لیکن دوسروں کا قہقہہ بلند کرنے کے ہتھیار بہم کرتے ہیں۔ قاضی نے بھی اختر شیرانی کی اسی نظم او دیس سے آنے والے تبا، پر پیروڑی لکھی ہے جس پر بلبل نے خوشہ چینی کی ہے بلبل اس پیروڑی میں اپنے وطن کشمیر میں رہنے والے دوستوں اور عزیزوں کا حال دریافت کرنے کے خواہاں ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ماگام تحصیل ڈل، گلمرگ وغیرہ جیسے تاریخی مقامات کو یاد کرتے ہیں جن کی عطر بیز ہواؤں سے وہ بچپن میں محظوظ ہوئے ہیں اور اب بھی ان ہواؤں کا رس اور مس اُن کی رگ رگ میں گردش کر رہا ہے۔ نظم کا یہ بند ملاحظہ کیجئے:۔

او دیس سے آنے والے تبا

کس حال میں ہیں یارانِ وطن　　ڈارانِ وطن، کارانِ وطن
سیخانِ وطن، لالانِ وطن　　پیرانِ وطن، میرانِ وطن
ماگام کے خوش فرغانِ وطن　　ڈل تحصیل کے سلوزانِ وطن
گلمرگ کے گلپوشانِ وطن　　سنبل کے سیہ چشمانِ وطن

او دیس سے آنے والے تبا

اور اب قاضی غلام محمد کا مخصوص رنگ دیکھئے:۔

کیا اب بھی وہاں ہر گنجا سر　　اسکالر سمجھا جاتا ہے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کیا اب بھی وہاں کا ہر ایم اے — غالب پر کچھ فرماتا ہے
اور جہل کی ظلمت میں کھو کر — اقبال سے بھی ٹکراتا ہے
او دیس سے آنے والے بتا

'خندۂ گل' کا دوسرا حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ یہ بلبل کی باعنوان یعنی مسلسل غزلیں ہیں عنوانات بڑے دلچسپ ہیں۔ ان غزلوں کے مطالعے سے بھی بلبل کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ یہ عنوانات کچھ اس طرح ہیں:۔

ایسی تیسی غزل، فرونٹی غزل، ہنگا کی غزل، کڑوی غزل، رٹی غزل، طبی غزل، نوجی غزل، موٹر غزل، جغرافیائی غزل، موچیانہ غزل، باولی غزل۔ یہ عنوانات بلبل نے ردیف اور قافیے کی مناسبت سے رکھے ہیں۔ ان میں سے بعض غزلوں میں اول سے آخر تک گہرا ربط دکھائی دیتا ہے۔ موضوعاتی غزلوں کے لئے جدید اردو شاعر باقر مہدی بھی انفرادیت رکھتے ہیں۔ اپنی سیاہ اور سفید غزلوں کے لئے وہ جدید غزل میں نمایاں مقام بنا چکے ہیں۔ اُن کی یہ غزلیں اپنے اندر گہرا درد رکھتی ہیں۔ اس کا مطلب نہیں کہ بلبل کاشمیری غزل گوئی پر پوری گرفت نہیں رکھتے۔ اُن کی غزلوں میں بھی اُن کی نظموں کی طرح شوخی اور طنز و ظرافت کی جھلکیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ بلبل غزل کہنے کا اپنا مخصوص انداز رکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ اپنے اظہار کے لئے نظم کو ہی ضروری سمجھتے ہیں لیکن غزل سے بھی انہیں فطری مناسبت ہے اور اس کو شاعری کی مقبول ترین صنف تصور کرتے ہیں۔ انھیں کلیم الدین احمد کے اس خیال سے اتفاق نہیں کہ غزل نیم وحشی صنفِ سخن ہے۔ میرے ایک استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"غزل ۔ شاعری کی مقبول ترین صنف ہے کلیم الدین احمد نے اگر غزل کو نیم وحشی صنفِ سخن کہا ہے تو یہ اس کی اپنی ذاتی رائے ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایڈیٹر نامہ نگار کی رائے سے متفق ہو یا نامہ نگار ایڈیٹر کی رائے سے متفق ہو۔"

بہر حال مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ بلبل ایک اچھے غزل گو شاعر بھی ہیں۔ اُن کی باعنوان یا موضوعاتی غزلوں میں اُن کی نظم کی طرح طنز و مزاح کا پہلو کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:۔

؎ جس یار کی خاطر عاشق نے گھر بار کی ایسی تیسی کی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اُس یار نے یاری توڑی ہے اُس یار کی ایسی تیسی کی
(ایسی تیسی غزل)

چاہا شراب چھوڑ دوں کھا کر کوئی دوا
دیکھا تو ہیں شراب سے بڑھ کر دوا کی ریٹ — (ریٹی غزل)

ہر چیچک کے داغوں کی رونق تو دیکھ
رُخ یار کیا گلستان ہو رہا ہے — (طبی غزل)

مقامِ جنگ ہو یا امن، رہتا ہوں کمر بستہ
سپاہی ہوں مرا بستر ہمیشہ گول ہے ساقی — (فوجی غزل)

بنکاک کے پھولوں کی بلبل نے مہک سونگھی
گھومے گی مہک برسوں یہ خاک کی گلیوں میں
(بنکاکی غزل)

وہ شکر لب دغا کر کے کڑوا کیلا ہو گیا
ہم جسے کیلا سمجھتے تھے کریلا ہو گیا
(کڑوی غزل)

بلبل کی رگ رگ میں کشمیر کی عطر بیز فضائیں بسی ہوئی ہیں۔ اس موضوع پر اُن کی غزلوں میں بھی بے شمار اشعار ملتے ہیں جو روح کو تازہ کرتے ہیں کبھی وہ لندن میں بیٹھ کر کشمیری چائے کا لطف اُٹھاتے ہیں اور کبھی وہ خیالوں میں اپنے بچھڑے ہوئے گاؤں آجر پہنچ جاتے ہیں۔ کبھی زعفران کے ہرے بھرے باغوں میں بے اختیار گھومنے لگتے ہیں اور کبھی کشمیر کی خوبصورت جھیل ولر کی فضاؤں سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ بلبل کے یہ جذبات اُن کے کشمیر سے والہانہ عقیدت کی غمازی کرتے ہیں:

منافق ہو گیا ہوں میں بھی انگریزوں کی صحبت میں
مری مستی ولر کی جھیل ہے، ہے جام لندن میں

کل شب جو نکلا بلبل خستہ بہ شوق دید
ڈوبا ہے یاد آگیا ولر تمام رات

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

Gandhi Memorial College
SRINAGAR
Acc. No: 35534
Dated: ....

ہوا کشمیر اور پنجاب میں اب تک نہ سمجھوتا
ادھر یہ کانگڑی مانگے ادھر وہ کانگڑا سمجھے

ترے ڈھاکہ کی ململ کے اُجالے اور ہوتے ہیں
مرے کشمیر کے اُجلے دوشالے اور ہوتے ہیں

حضرت بلبل کے دل کی بھی سیاحت کیجئے
دیکھئے دارالخلافہ وادیٔ کشمیر کا

جس زعفران زار سے نسبت ہے آج تک
خوشبو مرے سخن میں اُسی زعفران کی ہے

بلبل کے قطعات بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔ ان میں بھی اُن کی نظموں اور غزلوں کی طرح انفرادیت ہے۔ ان میں کوئی فلسفہ نہیں بلکہ بلبل نے عام موضوعات طنز بہ انداز میں قلم بند کئے ہیں۔ یہ قطعات اُن کی ذاتی زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور حادثات کی عکاسی کرتے ہیں مثلاً:-

اب ہوا کے دوش پر اُڑتے ہیں لوگ   دو قدم دو ہاتھ کو دطو ہے
شادیاں ہوتی ہیں ٹیلی فون پر   کون کہتا ہے کہ دلی دور ہے

(دلی دور نہیں)

لفافہ خوبصورت اور دلکش تھا جو کل پہنچا
وہ قرطاس حسین دل سے لگا لینے کے قابل تھا
میں سمجھا تھا مری مریم نے مجھ کو یاد فرمایا
لیکن کر جب اسے کھولا تو دیکھا گیس کا بل تھا - (لفافہ)

تعلیم پانے آیا تھا میں اس خیال میں
شاید مرا شمار ہو اہلِ کمال میں
کیا کہئے کیسے گزرے ہیں لندن کے چار دن
دو فیکٹری میں کٹ گئے دو ہسپتال میں

(اعلیٰ تعلیم)

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند   کو [illegible]

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

لوگ تو ملک بیچ کھاتے ہیں یہ تو اک انجمن کا چندہ ہے (چندہ)

تو جب آتا ہے سامنے میرے تجھ کو جھک کر سلام کرتا ہوں
سمجھتا ہے مجھ کو کبڑا ہوں میں ترا احترام کرتا ہوں (اکبڑا)

'خندۂ گل' میں چند تضمینیں بھی ملتی ہیں۔ یہ اقبال، اکبر الہ آبادی، ضمیر جعفری اور فیض کے اشعار پر مشتمل ہیں۔

بعض متفرق اشعار اور آئینہ خانہ کے عنوان سے اس مجموعے کے آخر میں شاعر کی زندگی کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں جنھیں بلبل نے بڑے خوبصورت اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

بلبل زبان پر خاص دسترس رکھتے ہیں۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ وہ نرم اور عام فہم زبان کا سہارا لے کر خیالات کو پیش کرنے کے اہل ہیں۔ 'خندۂ گل' کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی زبان سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ انگریزی الفاظ کو بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ اُن کے ہاں شوخ تراکیب بھی ملتی ہیں اور نئے علائم بھی۔ وہ کبھی کبھی خوبصورت تشبیہات و استعارات کو بھی خاطر میں لانے سے عار نہیں کرتے۔ اُن کی شاعری میں اردو اور فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی الفاظ بھی ملتے ہیں جن کو انھوں نے اپنی شاعری میں مناسب ڈھنگ سے استعمال کیا ہے۔ بریڈ فورڈ، لینڈ، ہٹلر، ڈالر، میڈم، فیکٹری، بینک، شاف، مسٹر، مس، مارکیٹ، ہیٹر، ہیٹ، واشنگٹن، ووٹ، سوپر اسٹیشن، ٹیوب، ولسن، ہارٹ فیل، بینکاک، روسٹر، پیٹرول وغیرہ جیسے انگریزی الفاظ اُن کی شاعری میں کثرت سے ملتے ہیں۔

بلبل اگرچہ روایت پرست نہیں ہیں لیکن وہ روایت سے کنارہ کشی بھی نہیں کرتے۔ انھوں نے غالب، اقبال، انیس، اکبر الہ آبادی، میر کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اختر شیرانی کو بھی پسند کرتے ہیں۔ جدید اردو شاعری سے انہیں گہرا شغف ہے لیکن وہ ایسی شاعری پسند نہیں کرتے جس میں شعریت کی کمی ہو اور جو نثر کے لبادے میں لپٹی ہوئی ہو۔ میرے ایک استفسار کے جواب میں انھوں نے جدید اردو شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا۔ "جدیدیت سے اگر آپ کی مراد نئی شاعری یا نثری شاعری ہے تو میں

اس کا قائل نہیں ہوں۔ میں نے نئی شاعری پر ایک نظم لکھی ہے۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

اب کہاں پہلا ترنم شعر میں اب ترانے سنسنانے ہو گئے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بسمل اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ اُن کے مطابق ہند و پاک میں اگرچہ اس زبان کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں لیکن غیر ممالک میں اس کی بڑی توقیر ہے اور یہ دُنیا کی تیسری زبان تسلیم کی جاتی ہے۔ ایک استفسار کے جواب میں مجھے لکھتے ہیں:۔

> میں مشرق وسطیٰ، سارا یورپ اور امریکہ گھوم آیا ہوں اور دعویٰ سے کہتا ہوں کہ سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے غیر ممالک میں اس کا مستقبل درخشاں اور تابناک ہے اور اس وقت دُنیا کی تیسری زبان تسلیم کی جاتی ہے۔ البتہ اس کا مستقبل اپنے آبائی وطن میں تاریک سے تاریک تر ہوتا جا رہا ہے۔" لہ

بسمل ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قابلِ قدر انشا پرداز بھی ہیں۔ اُن کی نثر بھی اُن کی شاعری کی طرح مطالعے کی چیز ہے۔ اس میں بھی ظرافت کی چاشنی کے ساتھ ساتھ فکر کی گہرائی جا بجا ملتی ہے۔ اُن کی نثر پر الگ سے مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔

لہ۔ بسمل کاشمیری کا ایک خط راقم السطور کے نام۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

عنوان چشتی کی غزل

اُردو ادب میں بعض ایسے مشاہیر پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے نثر کے ساتھ ساتھ شاعری کو بھی اپنی جولانگاہ بنایا اور اس کو تازگی اور توانائی بخشی۔ غالبؔ، اقبالؔ، حالیؔ اور اس طرح کے بیشمار فن کاروں کو چھوڑ کر اس صدی میں جن قلم کاروں نے نثر کے ساتھ ساتھ شاعری کے گلستان میں قسم قسم کے رنگ بکھیر دیئے۔ ان میں آل احمد سرورؔ، احمد ندیم قاسمی، علی سردار جعفری، مسعود حسن خاں، نعیم صدیقی، کالی داس گپتا رضاؔ، شمس الرحمٰن فاروقی، وحید اختر، وزیر آغا، باقر مہدی، شمیم حنفی، جگن ناتھ آزاد اور خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ایسے ہی فن کاروں کی صف میں پروفیسر عنوان چشتی کا نام بھی خصوصیت کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ عنوان چشتی نے عکس و شخص، اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے، معنویت کی تلاش، اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت، تنقید سے تحقیق تک، تنقیدی پیرائے وغیرہ جیسی قابلِ قدر تصنیف لکھ کر اُردو تنقید و تحقیق کے میدان میں ایک مخصوص جگہ بنائی ہے اور اپنی سادہ طرزِ نگارش اور سلیس و دلکش اسلوب سے تنقید کے ساتھ ساتھ اُردو شاعری میں بھی رنگ آمیزی کی ہے اور جدید شعراء میں نام پیدا کیا ہے۔

پروفیسر عنوان چشتی نے اپنی شاعری کا آغاز ۱۹۴۹ء سے کیا۔ ابتدا میں ٹوٹے پھوٹے لیکن بامعنی اشعار کہے۔ ۱۹۵۰ء میں پہلی غزل کہی جو جناب رام کرشن مضطرؔ کے توسط سے روزنامہ ملاپ، دہلی میں شائع ہوئی۔ یہ عنوان کے لئے نہایت ہی حوصلہ مند قدم تھا لیکن ۱۹۵۱ء میں انہیں یکایک احساس ہوا کہ وہ شعر کہہ سکتے ہیں جب اُن کی نظم "سلام اے مسافر" ماہنامہ شاعر بمبئی میں شائع ہوئی۔ اور تاحال برصغیر ہند و پاک کے رسائل و اخبارات میں مسلسل چھپتے رہے۔ عنوان کی شاعری کو نکھارنے اور سنوارنے میں اُن کے گھریلو ماحول کا زبردست ہاتھ رہا ہے۔ اُن کے دادا حضرت شاہ سید نور الحسن چشتی نورؔ منگلوری، والد حضرت شاہ سید انوار الحسن چشتی انوارؔ منگلوری، عمِ مکرم حضرت شاہ اسرار الحسن چشتی رازؔ منگلوری بھی اپنے دور کے صوفی بزرگ، درویش صفت اور شاعر تھے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

عنوآن کی والدہ ماجدہ کی طبیعت بھی موزوں ہے اور وہ کلاسیکی شاعری سے خاصا لگاؤ رکھتی ہیں ان بزرگوں اور اساتذہ فن کے خیالات نے عنوآن کے فن میں بھی وسعت پیدا کر دی اور اُن کے قلم میں تازگی اور توانائی پیدا ہوئی۔ دوسری طرف عنوآن صاحب شروع ہی سے دردمند دل اور ذوق نغمہ لے کے آئے تھے۔ وہ عالم طفلی میں لوری، نغمہ، رنگ و آہنگ اور موسیقی سے دل بہلایا کرتے تھے۔ چنانچہ جب حساس آدمی کے پاس یہ تمام سہولیات میسر ہوں تو وہ شاعری کی طرف گامزن کیوں نہ ہو۔ پروفیسر عنوآن چشتی اپنے شعری محرک کے بارے میں ڈاکٹر ابن کنول کے استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

" جہاں تک محرکات یا اسباب و علل کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ قسام ازل نے مجھے شروع ہی سے دل دردمند اور ذوق نغمہ کی دولت عطا کی تھی۔ میری والدہ ماجدہ نے اس بات کو بار بار جتایا کہ میں عالم طفلی میں لوری، نغمہ سنجی اور موسیقی سے بہلتا تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد یہی ذوق نغمہ نے ذوق سماع اور فکر سخن کی آبیاری کی۔"

تقسیم ملک کے واقعات بھی عنوآن کے دل پر گراں گزرے۔ چونکہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ملک بھارت کی ثمر بار تہذیب کے پروردہ ہیں۔ اس لئے وہ ملک و قوم کے نہائیت ہی ابتر حالات سہہ نہ سکے۔ اُن کا شعور اس وقت بیدار ہونے لگا جب انگریز نے اس ملک میں نفرت کا زہر پھیلا دیا تھا۔ ہر طرف قتل و غارت، خونریزی، فرقہ وارانہ فسادات اور بربریت کا بازار گرم تھا۔ عنوآن یہ سب کچھ نہ دیکھ سکے۔ اُن کے دل پر ان تمام حالات کے اثرات منقش ہونے لگے اور شاعری رنگ میں ڈھلنے لگے۔ ایک اور جگہ پر لکھتے ہیں:

" میں ۱۹۴۸ء میں درجہ ششم کا طالب علم تھا۔ گھر میں فرقہ وارانہ فسادات کا روزانہ ہی ذکر رہتا۔ لوگوں پر ایک خوف اور دہشت کا آسیب مسلط تھا۔ ایک دن اچانک خبر آئی کہ ایک قصبے میں ایک فرقہ کے ہزاروں بے گناہ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ میرے دل پر اس دل خراش حادثہ کا بے حد اثر ہوا۔"

یہ دردناک اور دلخراش واقعات عنوآن کے تحت الشعور میں اب تک بھی رچے بسے ہوئے ہیں۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں:۔

میں تو دکھ دیدی سچی بات چاہتا ہوں ــــ فسانہ تو پھر یہ واقعہ بیان چاہتا ہوں

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ایک اور جگہ بڑے واضح الفاظ میں اس کا تاثر یوں پیش کرتے ہیں :۔

؎ جب برا وقت پڑا تو مجھے معلوم ہوا میرا دشمن تھا مرے سائے میں پلنے والا

یا ؎ جو امنِ شہر کے ضامن ہیں کرفیو میں وہی
سنا یہ ہے کہ بہت قتلِ عام کرتے ہیں

عنوان چشتی کی شاعری گل و بلبل کی شاعری نہیں بلکہ اس میں ایک خاص قسم کا امتزاج پایا جاتا ہے جو انہیں نئی شاعری کی صف میں ایک قابلِ قدر مقام دلاتا ہے۔ اُن کے ہاں نہ تو محمد علوی کی طرح جنسی مسائل کی کارفرمائی ملتی ہے اور نہ بلراج کومل کی طرح طول کلامی بلکہ اُن کی غزلیں خلیل الرحمٰن اعظمی کی غزلوں کی طرح رواں دواں اپنی ارتقائی منزلوں کو طے کرتی ہوئی آگے چلی جاتی ہیں۔ عنوان کی غزلوں میں جدیدیت کے ساتھ ساتھ کلاسیکی شاعری کا لوچ اور دمک ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اسی لئے وہ غزل کی جمالیات میں اس کی ہئیت کو خاص اہمیت دینے کے قائل ہیں۔ غزل کی تخلیق میں کلاسیکی نظم و ضبط اور فنکارانہ جمال کا ایک خاص تصور اُن کے پیشِ نظر رہتا ہے۔ چنانچہ ان تمام باتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں :۔

"میں غزل کی جمالیات میں اس کی ہئیت کو خاص اہمیت دیتا ہوں اس لئے کلاسیکی نظم و ضبط اور فنکارانہ جمال بھی میرے پیشِ نظر رہتا ہے۔ آتش نے شاعری کو مرصع سازی کا فن کہا تھا۔ وہ غلط نہیں تھا، اچھی شاعری کے لئے اچھے اور سچے افکار و جذبات کے ساتھ بہترین اور موزون اسلوب بیان بھی ضروری ہے جس کے لئے عروضی اور لسانی نیز فنی چابک دستی بھی ضروری ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ عنوان چشتی کی شاعری آج کل کے بیشتر جدید شعراء کی طرح قاری کو پریشان نہیں کرتی اور نہ ابہام کا راستہ اختیار نہیں کرتی بلکہ اس میں ایک چھوٹی سی پہاڑی ندی کا زیر و بم پیدا ہوتا ہے اور قاری اس کے مطالعہ سے محظوظ ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

؎ ممکن ہو تو کچھ اشک ہی آنکھوں میں بچا لو
سنتے ہیں کہ اب شہر میں پانی نہ ملے گا

؎ یہ کیسا شخص ہے کیوں جنگلوں کی بات کرتا ہے
کہ اس سے شہر کی شائستگی دیکھی نہیں جاتی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ؔ آنکھوں میں کرب، دل میں مزے زلزلوں کے ہیں
اِن انگلیوں میں لمس جو دُکھتی رگوں کے ہیں

ؔ ڈوبنے والا ڈوب رہا ہے اور یہ کہتا جاتا ہے
اُس کی آنکھوں کی جھیلوں کا پانی کتنا میٹھا ہے

ؔ فلک کی سمت نہ دیکھو اُفق کی بات کرو
سُنا ہے چاند زمین پر اُترنے والا ہے

ؔ سُنا ہے میرا دشمن آئینے سے خوف کھاتا ہے
کہ اُس سے اپنی ہی بے چہرگی دیکھی نہیں جاتی

عنوان چشتی کی غزلیں اپنے معصوم انداز اور رویّے سے جانی اور پہچانی جاتی ہیں ان میں احساس کا تیکھا پن اور برجستگی ہے۔ عنوان کی غزلوں میں معنوی تہہ داری کے ساتھ ساتھ الفاظ کا برمحل استعمال بھی ملتا ہے۔ اس میں ایک بے نام سا درد، زخموں کی اَن گنت ٹیسیں، غم کی عجیب لذت بھری کیفیت ہوئی ملتی ہے۔ عنوان کے ہاں درد، غم اور مایوسی سہنے کا گہرا شعور ملتا ہے مگر مایوسی اور نامرادی کے حصار میں بھی وہ ایک باشعور انسان جس کو زندگی کی تلخیوں نے پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اپنے ضبط و قناعت کے سہارے سے ٹوٹ کر نہیں رہ جاتا بلکہ اسے خود شناسی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آدمی پہ آدمی کے قہر نے اُنھیں ظلم، حق تلفی، ناانصافی، معاشی ناہمواری، فرقہ پرستی، زرگری اور کمزوری اور غریبوں کے استحصال، خود غرضی اور مکر و ریا سے متنفر کیا ہے۔ چنانچہ ان تمام باتوں کا احساس اپنی غزلوں میں یوں دلاتے ہیں۔

ؔ وہ لوگ رُوح کی ویرانیوں کو کیا سمجھیں
جو خشک جھیل کو چشم پُر آب کہتے ہیں

ؔ مجھ کو جو نورِ حق سے ہے حصہ ملا ہوا
دل بجھ گیا ہے پھر بھی ہے چہرہ کھلا ہوا

ؔ ہماری تشنہ لبی پر نہ جا کہ ہم اکثر
سمندروں کو بھی ہوئے کم آب لکھتے ہیں

ؔ غلط ہے یہ کہ تو شبنم ہے یا شرارہ ہے
ترا جمال محبت کا استعارہ ہے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

؎ میں کہ سورج نہیں ہر شام کو ڈھلنے والا
ہو گیا راکھ مرے سائے سے جلنے والا

عنوان چشتی کی شاعری میں حیات و کائنات کے مسائل انسانیت کی الجھنیں اور معاشرے کا کرب اپنے پورے تب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ اُن کے بیشتر اشعار میں طنز بھی ہے اور تیکھا پن بھی۔ وہ کبھی سماج اور سوسائٹی پر طنز کرتے ہیں۔ کبھی سیاسی ٹھیکیداروں پر اور کبھی مذہبی کارندوں پر۔ حتیٰ کہ وہ خود اپنے آپ کو بھی کبھی کبھی طنز کا نشانہ بنا دیتے ہیں۔

عنوان کا لہجہ بڑا نرم ہے۔ اُن کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے کسی گرانباری یا ثقالت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ وہ بالکل ملائم الفاظ میں بات کہنے کا گر رکھتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں میر اور غالب کے ساتھ ساتھ فیض کا رنگ بھی جھلکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کہیں کہیں ناصر کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی اور ابن انشا کا انگ بخوبی پہچانا جاتا ہے۔ جہاں عنوان کے بعض اشعار میں نرگسیت کا احساس ہوتا ہے وہاں ڈرامائی عنصر سے بھی اُن کے اشعار خالی نہیں۔ خود کلامی کا جذبہ بھی اُن کے اشعار میں کہیں کہیں بروئے کار آیا ہے۔ مثلاً

؎ دل بالک ہے بالک نادان دل کی بات پہ رونا کیا
پیار کی راہ میں اس نے ابھی تو پہلی ٹھوکر کھائی ہے

؎ تم چاہو تو نذر کروں میں تم جو کہو تو پیش کروں
ایک ہی ٹوٹا ہوا دل ہے کوئی نئی سوغات نہیں

؎ دل آئینہ ہے اس میں سنور کیوں نہیں جاتے
تم چاند ہو پھر چاند نگر کیوں نہیں جاتے

؎ بکھرے ہیں اکیلے ہیں جیسے چاند تاروں میں
اپنی ذات میں لیکن انجمن ہیں صوفی جی!

؎ ذوقِ نظر مجبور کرے ہے کرنوں کی پیمائش پر
خالی آنکھیں یہ کہتی ہیں چاند نگر سے کچھ بھی نہیں

عنوان چشتی کی غزلوں میں اشاریت، سادگی، شخصی جذبات اور عصری تقاضے بھی پائے جاتے ہیں۔ اُن کی غزلوں میں ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ درد و کرب کا پہلو بھی ملتا ہے۔ وہ تشبیہات اور استعارات سے معنی و مفاہیم کی ایک نئی دنیا تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ بعض جگہوں پر وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ عنوان کی غزلوں میں علامت سازی اور تمثیل نگاری کا ایک خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ اُن کے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہاں شہر، دل، گھر، شخص، محبت، سناٹا، سفر، سمندر، آگ، خوشبو، قتل، زندگی، سورج، شبنم، روشنی، پتھر، نظر، دشت، دریا، تنہائی، دھوپ وغیرہ جیسے الفاظ کی بڑی قدر و قیمت ہے۔ وہ ان الفاظ کے ذریعے سے نہ جانے کتنے پیکروں کو زندگی بخش دیتے ہیں۔ یہاں پر اشعار مثال کے طور پر پیش کرنے بے محل نہ ہوں گے۔

؎ جنگل کی فضائیں بھی دلآویز ہیں لیکن
جنگل کے لئے شہر کو چھوڑا نہیں جاتا!

؎ مجھ کو جو نورِ حق سے ہے حصہ ملا ہوا
دل بجھ گیا ہے پھر بھی ہے چہرہ کھلا ہوا

؎ آنگن سے مرے روز ابھرتا ہے نیا چاند
لیکن یہ رخِ جانِ سحر کس کی طرف ہے

؎ میرے گھر سے اس کے گھر کا فاصلہ کوئی خاص نہ تھا
وہ بھی پانی مانگ رہا ہے جس نے آگ لگائی ہے

؎ جو تم ہو ساتھ تو چاروں طرف اجالا ہے
اب اس سفر میں کسی اور کی ضرورت کیا

؎ جمال و جسم کا پیکر سحر چلنے والا ہے
سنا ہے رات کو سورج نکلنے والا ہے

؎ لہو لہو جو مرا سر مجھے دکھائی دیا
خود اپنے ہاتھ میں پتھر مجھے دکھائی دیا

الفاظ کے معاملے میں بھی عنوان کفایت شعاری سے کام لیتے ہیں۔ وہ کم سے کم الفاظ میں بڑی سے بڑی بات کہنے کے قائل ہیں۔ یہ خصوصیت اُن کے تنقیدی افکار میں بھی ملتی ہے۔ فنکار کا یہ برتاؤ فن میں خود بخود نکھار لاتا ہے۔ عنوان کی شاعری میں ایک اور خصوصیت اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے ملائم الفاظ کا استعمال ہے۔ اُن کی غزلوں میں تن من، رتجگوں، سپنے، بھجن، پیو، بالک، نگر، دھوپ، کرن، آنگن، کٹھن، پردیس، جل، آنچ، چنچل، گوری، سُروں، کلی، رس، بھونرا وغیرہ جیسے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اردو اور ہندی کے اس طرح کے سنگم نے اُن کی شاعری میں اور بھی مٹھاس اور نغمگی پیدا کی ہے۔ عنوان کے ہاں نئی اور جاندار تراکیب کا استعمال بھی ملتا ہے۔ حضورِ عشق، نظامِ نو، حیاتِ نو، نقشِ کامل، شامِ انتظار، انجمنِ شمشاد، سوزِ جگر، اہلِ سفر، چشمِ پُرفن، نقابِ رخ، تکمیلِ تمنا، دلِ زار، تصویرِ صبح، کامگارِ زیست، دورِ نو، اندازِ جنون، امنِ ساحل وغیرہ صرف چند تراکیب ہیں جن کے استعمال سے عنوان کی شاعری میں برجستگی پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً

؎ نظامِ نو کا تلون حیاتِ نو کا جمود
؎ انجمن شمشاد قداں میں دیوانوں کی بات چلی

؎ کہ جی گھبرا گیا ہے چراغ زیرِ داماں سے
؎ زیبِ آغوشِ محبت ہی محبت ہوگی

؎ اعلانِ حق کو کہتا ہے عہدِ کہن کی بات
؎ ساحل تک آتے ہی رخِ طوفان بدل گیا

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

؎ یہ دشتِ وحشت انا ہے یہاں نہیں ہے کوئی

؎ یہ فردِ جرم نہیں خود نوشت ہے میری

ذوقِ جمال اور نیم باز کے نام سے عنوان چشتی کے دو شعری مجموعے اب تک منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ذوقِ جمال میں ۱۹۵۳ء سے کر ۱۹۶۵ء تک کا کلام ملتا ہے۔ اگرچہ یہ عنوان چشتی کا ابتدائی کلام ہے لیکن پھر بھی ان غزلوں میں لطافت اور چاشنی برقرار رہے ہے۔ اس دور کی شاعری میں اگرچہ زیادہ توجہ عشق، حسن، ہجر، وصال، سرکشی، بغاوت اور انقلاب وغیرہ جیسے موضوعات پہ ہے لیکن پھر بھی ان میں جدت کا عنصر غالب ہے۔ عنوان چشتی کا دوسرا مجموعۂ کلام نیم باز کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے کی غزلوں میں برجستگی کے ساتھ ساتھ گہرائی اور گیرائی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ محاورات کا برمحل استعمال تشبیہات و استعارات کی حسن کاری اور تراکیب کو خوبصورتی سے پیش کرنے کا ڈھنگ عنوان کے اس دور کی شاعری کا حاصل ہے۔ اس دور میں اُن کے اشعار بالکل صاف واضح اور پُر معنی ہیں۔ عنوان چشتی سے کہیں کہیں چوک بھی ہوئی ہے۔ ان کی غزلوں میں نئے اور پُر معنی الفاظ اور تراکیب کے ساتھ ساتھ بعض متروک الفاظ اور دور از کار تراکیب بھی دیکھنے میں آتی ہیں جن سے اُن کی غزلوں میں کہیں کہیں تخیل کی پرواز کم ہوگئی ہے لیکن مجموعی طور پر اُن کی غزلیں مطالعے کی چیز ہیں۔ عنوان نے چند نظمیں بھی کہی ہیں لیکن وہ اوّل سے آخر تک غزل کے شاعر ہیں۔ عنوان چشتی ایک قابلِ قدر نقاد بھی ہیں اس لئے فن کارانہ زاویۂ نگاہ سے شعر کو جانچنے پرکھنے اور برتنے کے فن سے کماحقہٗ واقفیت رکھتے ہیں اور یہی کیا کم ہے ؛

ماہنامہ تعمیر سرینگر، جلد ۲۲، شمارہ ۶، فروری، مارچ ۱۹۹۳ء

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

عابد مناوری - چند یادیں چند ملاقاتیں

آج دوپہر جب میں نے یہ منحوس خبر سنی کہ عابد مناوری بھگوان کو پیارے ہو گئے تو مجھ پر سکتہ سا طاری ہوا۔ کچھ دیر کے لئے یقین ہی نہیں آیا۔ معلوم ہوا تھا کہ اُن کی طبیعت نڈھال رہتی ہے اور ذیابیطس کی شکائت سے کمزور ہو گئے ہیں لیکن یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اتنی جلدی ہم سے جُدا ہو جائیں گے اور ہزاروں چاہنے والوں کو سوگوار کر چھوڑیں گے۔

عابد ایک باصلاحیت شاعر تھے۔ میں اُن کی شاعری کے توسط سے آج سے لگ بھگ پچیس ۲۵ برس قبل اُن سے متعارف ہو چکا تھا لیکن ملاقات کا شرف کافی دیر کے بعد حاصل ہوا۔ غالباً ۱۹۷۰ء کی بات ہے۔ میرے چند افسانے اور ادب پارے روزنامہ آفتاب[۱] سرینگر کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہو چکے تھے اور نہ جانے اب کیوں مجھ پر شعر و شاعری کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ گھر میں والد محترم ڈاکٹر برج پریمی (مرحوم و مغفور) میری نثر کو دُرست کیا کرتے تھے، جب میں نے اچانک شعر و شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو انھوں نے مجھے اپنے ایک دوست حکیم منظور کے سپرد کر دیا۔ حکیم صاحب بڑی دلنواز شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے مجھے شعر و ادب کے رموز سے آگاہ کیا۔ ایک دن میں حسب معمول اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اُن کے ساتھ شعر و ادب پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔ کمرے میں ایک اجنبی داخل ہوئے اور ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ اجنبی نہایت ہی خاموش معلوم ہوتے تھے لیکن کبھی کبھی ہماری گفتگو سُن کر زیرِ لب مسکرا دیتے تھے۔ جب میں تھوڑی دیر کے بعد رخصت ہونے کے لئے تیار ہوا تو حکیم منظور نے اجنبی کے ساتھ میرا تعارف کرایا۔ "یہ ہیں عابد مناوری ۔ گوری نندن سنگھ بالی! جموں سے کل ہی آئے ہیں"۔ میرے لئے یہ جانا پہچانا نام تھا ہی۔ اُن کو دیکھ کر "بہار غزل"[۲] کے چند شعر بے ساختہ یاد آ گئے۔

---

[۱] میری پہلی نظم "تارے" کے عنوان سے جون ۱۹۶۸ء کے ماہنامہ پیام تعلیم دہلی میں شائع ہوئی۔

[۲] عابد مناوری کا پہلا مجموعہ کلام

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اپنی اپنی نظر ہے اے عابد — زندگی پھول بھی ہے کانٹا بھی
ہر گلی میں ہیں ہر زبان پہ ہیں — میری دیوانگی کے افسانے
یہ غزل بھی تمہاری عابد — ہر کسی نے پسند کی ہے
میرے شعروں پہ جھوم کر عابد — داد دیتے ہیں عرش صہبائی

عابد صاحب نہایت ہی شفقت سے پیش آئے۔ انھوں نے مجھے گلے سے لگایا اور دعائیں دیں۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک عابد صاحب سے کوئی ملاقات نہ ہو سکی لیکن انھوں نے اپنی شرافت سے مجھے نہال کر دیا جس کے نقوش آج بھی میرے دل و دماغ پر مرتسم ہیں۔

سنہ ۱۹۷۶ء میں سرینگر کے ٹورسٹ ریسپشن سنٹر میں آل انڈیا ہندی اُردو سنگم (سرینگر شاخ) کی طرف سے ایک یادگار مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس انجمن کے روحِ رواں میرے عزیز دوست نذیر احمد نظیر تھے اور میں نے حال ہی میں اس کی سکریٹری شپ کا چارج سنبھالا تھا۔ پروفیسر شکیل الرحمن بھی اس انجمن کے ساتھ کچھ دیر کے بعد وابستہ ہوئے تھے اور اس طرح سے انجمن میں نئی جان آگئی تھی چنانچہ معروف دانشور اور سیاستدان شری ڈی پی دھر (مرحوم) کی پہلی برسی کے موقعہ پر اُن کے بیٹے شری وجے دھر کے اشتراک سے ایک آل انڈیا مشاعرہ آراستہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ اپنی نوعیت کا یادگار مشاعرہ تھا۔ اس میں مقامی شعرا کے علاوہ ملک کے دور دراز شہروں سے تعلق رکھنے والے کئی نامور شعرا مدعو کئے گئے تھے۔ شہریار، فضا ابنِ فیضی، مخمور سعیدی، بمل کرشن اشک، مظہر امام، سلطان اختر، شام رضوی وغیرہ کے علاوہ سردار جعفری، کیفی اعظمی، اختر الایمان، جان نثار اختر، راہی معصوم رضا، نشتر خانقاہی، بیکل اتساہی وغیرہ کی شرکت بھی متوقع تھی۔ اس یادگار مشاعرہ میں جموں سے عابد مناوری بھی مدعو کئے گئے تھے۔ اس بار عابد سے کافی دیر تک مل بیٹھنے کا موقعہ مل گیا۔ عابد نے اپنے مخصوص انداز میں اپنی غزل پیش کی اور داد و تحسین حاصل کی۔

عابد صاحب کے ساتھ ایک اور ملاقات یاد آرہی ہے۔ وہ جموں کے محکمہ مالیات میں ملازم تھے۔ جیوتاوُن ہال میں واقعہ ہے۔ میں چند دنوں کے لئے جموں چلا آیا تھا۔ اور اپنے چھوٹے بھائی اوناش کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا جو اُن دنوں سانبہ (جموں) کے ہائر سیکنڈری

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

انسٹی ٹیوٹ میں بحیثیت لیکچرار تعینات ہو چکے تھے۔ ایک دن آوارہ گردی کرتے کرتے بغیر اطلاع دیئے عابد صاحب کے دفتر میں پہنچ گیا۔ تو وہ مجھے دیکھ کر حیران ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ اکاؤنٹس کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے لیکن عابد نے اسی وقت اپنی تمام سرکاری مصروفیات منسوخ کر دیں اور خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ میں ان کی باتوں سے نہال ہو گیا۔ بعد میں وہ مجھے اپنے گھر لے گئے اور بھابھی کی غیر موجودگی میں خود کھانا تیار کیا اور مجھے بڑے پیار سے کھلایا۔ یہ جنوری ۱۹۸۰ء کی ایک دوپہر کی بات ہے!

۱۹۹۰ء کے المناک واقعے سے متاثر ہو کر جب ہم گھر بار چھوڑ کر جموں چلے آئے، تو عابد کو بہت افسوس ہوا۔ تقریباً ہر دن ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ ہر وقت مجھے افسردہ دیکھ کر میری دلجوئی کیا کرتے تھے۔ انہی دنوں والد کی اچانک اور بے وقت موت نے جب میری زندگی کا شیرازہ بکھیر کے رکھ دیا تو عابد کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ ہر وقت میری ڈھارس باندھتے رہتے اور مجھے آگے چلنے کا حوصلہ دیتے رہے۔

عابد صاحب کے ساتھ بے شمار ملاقاتیں میرے ذہن کے تہہ خانے میں محفوظ ہیں۔ وہ ہر وقت محبت اور خلوص سے پیش آتے تھے۔ گزشتہ برس ان کی رفیقۂ حیات انتقال کر گئیں۔ یہ صدمہ وہ برداشت نہ کر سکے۔ وہ اپنے آپ کو ہر وقت تنہا محسوس کرنے لگے اور اکثر بیمار رہنے لگے۔ عابد پہلے ہی ذیابیطس کے شکار تھے۔ اس صدمے نے انھیں زندگی کی ہر خوشی سے محروم رکھا اور آخر ۱۹ ستمبر ۱۹۹۵ء کو اس دارِ فانی سے رخصت کر گئے۔

عابد مشاعروں کے کامیاب شاعر تھے۔ ریاست میں جہاں کہیں بھی مشاعرہ ہوتا تھا۔ ان کی حاضری یقینی تھی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں اپنی غزل پیش کرتے تھے اور سامعین سے داد حاصل کئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ مجھے بھی اکثر ان کے ساتھ محفلوں اور مشاعروں میں کلام پڑھنے کے مواقع ملے۔ وہ میری کافی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے اور جہاں کہیں بھی فنی نقائص دیکھتے تو فوراً آگاہ کیا کرتے اور مشورہ دیا کرتے تھے۔ اس وقت ایک ایسی ہی محفل یاد آ رہی ہے۔ آج سے تقریباً چار برس قبل بزمِ ادب جموں کی طرف سے یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں ایک محفلِ مشاعرہ منعقد ہوئی۔ سرینگر سے معروف افسانہ نگار پروفیسر مخمور بدخشی تشریف لائے تھے۔ شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی کے سابقہ صدر پروفیسر منظر اعظمی
... ایک محفلِ شعر کا انعقاد کیا گیا جس میں

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh. Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

راقم السطور کے علاوہ پروفیسر نظر اعظمی، پرتپال سنگھ بیتاب، محمد یٰسین بیگ، طالب یمن آبادی، ودیا رتن عاصی، اسرار شہروانی کے علاوہ کئی نو آموز شعرا نے شرکت کی۔ عابد صاحب بھی مدعو تھے۔ انھوں نے اُس روز بھی اپنے مخصوص انداز میں غزل سُنا کر سامعین کو سرشار کیا۔

جہاں کہیں بھی ادبی محفل منعقد ہوتی یا مشاعرہ کا اہتمام کیا جاتا تو سامعین اور شعرا دونوں عابد صاحب کا بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے۔

مقامی سطح پر منعقد کئے گئے مشاعروں اور محفلوں کے علاوہ عابد ہر بار آل انڈیا مشاعروں میں بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ ملک کے دُور دراز شہروں سے آئے ہوئے شعرا بھی اُن کا کلام سُن کر محظوظ ہو جاتے۔ وہ اپنی خداداد صلاحیت کی وجہ سے نہ صرف مقامی شعرا میں بلکہ اُردو کے نمائندہ جدید غزل گو شعرا میں شمار ہونے لگے تھے۔

ایک زمانے میں عرشؔ صہبائی اور عابدؔ کی شاعری کی ریاست میں بڑی دھوم تھی۔ دونوں اُستاد فن اور معروف شاعر جناب جوشؔ ملسیانی سے کسبِ فیض کر چکے ہیں۔ ایک مدت تک ان دو فنکاروں کی جوڑی سکۂ رائج الوقت تصور کی جاتی تھی۔ پھر ان کے ساتھ حکیم منظورؔ بھی وابستہ ہو گئے تو یہ ایک تکون کہلائی۔ ان تینوں شعرا نے ایک مدت تک ریاست کے ادبی دبستان میں ہلچل مچائی تھی۔ عرشؔ، عابدؔ اور منظورؔ تینوں اُردو کے نمائندہ شعرا میں شمار ہوتے ہیں اور اپنے مخصوص انداز اور منفرد اسلوب کے لئے مقبول ہیں۔ عرشؔ ملازمت سے ریٹائر ہو گئے ہیں اور لکھنے پڑھنے کے کام میں منہمک ہیں۔ حکیم منظورؔ شاعری کے ساتھ ساتھ اب صحافت سے بھی دلچسپی لینے لگے ہیں۔ اور سرینگر سے ایک ہفتہ وار اخبار نکال رہے ہیں۔ عابدؔ کے انتقال پر عرشؔ زار و قطار روئے۔ انھوں نے عابدؔ کا انتقال اپنا ذاتی نقصان قرار دیا۔

عابدؔ مناوری کا خاندانی نام گوری نندن سنگھ بالی ہے لیکن بہت کم لوگ اُن کو اس نام سے جانتے ہیں۔ اگرچہ اُن کا آبائی وطن تحصیل اکھنور کا ایک چھوٹا سا گاؤں مناور ہے لیکن اُن کی ولادت ۲۷ مئی ۱۹۳۷ء کو جموں میں ہوئی۔ اُن کے والد رائے زادہ برکت رائے بالی ایک باذوق اور پُرخلوص بزرگ ہیں۔ شرافت نفسی اور خودداری اُن کی رگ رگ میں پائی جاتی ہے۔ عابدؔ نے اس خاندانی وراثت کو زندگی بھر ہاتھ سے جانے نہیں دیا وہ خوددار اور غیور انسان تھے۔ عابدؔ نے اپنی تعلیم جموں کے مقامی اسکولوں سے حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد کالج میں داخلہ لیا مگر مزید تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ ۱۹۵۶ء

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

میں محکمۂ دیہات سدھار میں ملازم ہوئے۔ جب یہ فضا راس نہیں آئی تو کچھ عرصہ کے بعد محکمۂ حسابات میں کلرک ہو گئے۔ بچپن میں انھوں نے نہ جانے کون سے خواب دیکھے تھے۔ ان خوابوں میں رنگ بھرنے کی انھوں نے اگرچہ جی توڑ کر محنت کی لیکن تقدیر کس کا ساتھ دیتی ہے۔ اپنی تقدیر کو کوستے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

تیری تقدیر میں لکھا ہے یہی اے عابدؔ
خواب تو دیکھ مگر خواب کی تعبیر نہ دیکھ

عابدؔ اپنی بے پناہ محنت اور صلاحیت سے ملازمت کے دوران مختلف عہدوں پر فائز رہے لیکن اُن کا کام ادبی نہیں بلکہ حسابات کا تھا۔ اگر انہیں کسی ادبی ادارے میں ملازمت ملی ہوتی تو یقیناً اپنی صلاحیتوں سے انھوں نے کئی اور قابلِ قدر ادبی کارنامے انجام دیے ہوتے لیکن یہ بھی کیا کم اہم ہے کہ وہ عمر بھر لوگوں کے حسابات درست کرتے رہے اور اُن کی گتھیوں کو سلجھاتے رہے۔

عابدؔ شروع سے ہی شاعرانہ ذہن رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۵۹ء سے کیا۔ ابتدائی کلام حضرت جوشؔ ملسیانی کو دکھایا کرتے تھے جو اُن دنوں اپنے تلامذہ کے سلسلے میں اکثر جموں آیا کرتے تھے۔ عابدؔ نے شعر و شاعری کے رموز کے سلسلے میں جوشؔ سے پورا پورا استفادہ کیا۔ وہ اُن کی استادانہ صلاحیت کے قائل تھے۔ انھوں نے اپنی کئی ابتدائی غزلوں میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

دھوم ہے جو کلام عابدؔ کی
جوشؔ صاحب کا فیض پیہم ہے

عابدؔ کا پہلا مجموعۂ کلام ۱۹۶۱ء میں بہارِ غزل کے نام سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ اُن کی غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ یہ غزلیں نہایت ہی مختصر بحور میں کہی گئی ہیں۔ اگرچہ ان غزلوں میں روایتی رنگ غالب ہے لیکن عابدؔ نے اپنی فنکارانہ چابکدستی ہاتھ سے کبھی بھی جانے نہیں دی۔ حضرت جوشؔ کو بھی اپنے اس شاگرد پر بڑا فخر تھا۔ وہ عابدؔ کی خداداد صلاحیت کے قائل تھے۔ اپنے شاگرد کے کلام پر داد دیتے ہوئے بہارِ غزل کے پیش لفظ میں رقمطراز ہیں:

"بہارِ غزل" عابدؔ مناوری کے کلام کا مجموعہ ہے۔ عابدؔ صاحب میرے ہی عزیز [illegible]

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اور ذوقِ شعری کا مُدّاح ہوں جو کچھ کہتے ہیں کافی سوچ سمجھ کر کہتے ہیں۔ چھوٹی بحروں میں تو اُن کی شگفتہ بیانی ہر شعر کو شاخِ گُل بنا دیتی ہے۔" لہ

'بہارِ غزل' کی غزلیں اگرچہ روایتی انداز میں کہی گئی ہیں لیکن اس میں بعض ایسے خیالات ملتے ہیں جن میں انفرادیت ہے۔ عشق و عاشقی کی رنگا رنگی عابد کے اس دور کی غزلوں میں نمایاں طور پر ملتی ہیں۔ اس موضوع کو عابد نے شروع سے ہی نئے انداز سے برتا ہے۔ وہ کبھی محبوب کی جفا اور عاشق کی وفا کی بات کرتے ہیں۔ ہجر کا درد اور وصال کی لذّت محسوس کرتے ہیں۔ گُل کی چٹک اور بلبل کے نغمے نے انھیں شروع سے ہی سرشار کیا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ دُنیاوی مسائل پر بھی توجہ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن کے مطابق ایک انسان کو اس دُنیا میں خوشیاں کم اور مایوسیاں اور نامرادیاں زیادہ ملتی ہیں۔ عابد بھی دُنیا کے ان مسائل سے دوچار ہیں۔ انھوں نے ہر قدم پر ٹھوکر کھائی ہے لیکن ہنس ہنس کر مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کیا ہے۔ وہ ایک حساس شاعر تھے۔ اُن کی نگاہ ہر ایک مسئلے پر رہتی تھی۔ کبھی کبھی جب وہ مکمل طور پر بے بس ہو جاتے تھے تو میخانے کی راہ اختیار کرتے تھے اور اپنا غم غلط کرنے کے لئے دو چار گھونٹ پی لیتے تھے۔ ان خیالات کی تصدیق وہ خود اپنے اشعار میں کرتے ہیں۔ مثلاً

جس نے دُنیا میں حق پرستی کی — اُس کو جینے دیا نہ دُنیا نے
واقعی اس میں زندگی ہے — ہم نے پی کر بھی دیکھ لی ہے
کھول دے میکدے کا در ساقی — غمزدوں کی برات آئی ہے
تلخ باتیں ہمیں پسند نہیں — جو بھی پوچھو وہ پیالے سے پوچھو
تیری آنکھیں ہیں وہ مقام جہاں — مے پرستی بھی مات کھاتی ہے
حاصلِ زندگی ہیں وہ لمحات — جو تیری بزم میں گزارے ہیں

'شمیمِ گُل' کے نام سے عابد کا ایک اور مجموعہ ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ اس میں غزلوں کے ساتھ ساتھ اُن کی نظمیں، قطعات اور چند رُباعیات بھی شامل ہیں۔ جہاں تک ان غزلوں کا تعلق ہے یہاں اُن کی زبان میں ایک نمایاں تبدیلی رونما ہوتی نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ اس کی زبان فارسی آمیز اور تراکیب قدرے مشکل نظر آتی ہیں لیکن اس تبدیلی کے ساتھ

لہ۔ بہارِ غزل۔ عابد مناوری، ص ۴۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ساتھ شعر کا حسن برقرار رہتا ہے۔ شمیم گل میں بعض غزلیں گیت کے فارم میں بھی ملتی ہیں۔ یہ غزلیں نرم لچکیلی ہیں لیکن اپنے اندر گہری معنویت رکھتی ہیں۔ مثلاً :-

کس نے مجھ کو یاد کیا ہے
دل کا اک اک زخم ہرا ہے
میں تجھ کو تو مجھ کو جانے
میرا تیرا بھید ہی کیا ہے
سب کی اپنی اپنی نظریں
کون اچھا ہے کون برا ہے
گہرا ساگر چنچل لہریں
جیون کا غزل کی نیا ہے
میری غزل وہ سن کر بولے
عابد شاعر البیلا ہے

ایک اور غزل اسی لب لہجے میں ملاحظہ کیجئے :-

دھرتی کا ہر چپہ درپن
اس کا جلوہ آنگن آنگن
کس کے ہجر میں جوگ لیا ہے
بول اے شو مندر کی جوگن
بس اک پیار کا پھول کھلا تھا
پھر کانٹوں سے بھر گیا دامن
اس کی دید کو آنکھیں ترسیں
جس کا جلوہ آنگن آنگن
پھر کوئی یاد آیا عابد
پھر اشکوں سے تر ہے دامن

شمیم گل میں عابد ایک مختلف زاویئے سے سامنے آتے ہیں۔ اس میں غم دوراں کے ساتھ ساتھ غم جاناں کی کیفیت بھی اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ ابھرتی ہے۔ خمریات کے موضوع پر شمیم گل میں جو اشعار ملتے ہیں۔ ان میں زیادہ تازگی اور توانائی آئی ہے عابد بھی جگر کی طرح جب میخانے میں جاتے ہیں تو ناصح کی باتوں کو عمل میں لانے کے لئے تیار نہیں ہوتے ہیں۔ عابد پینے کے بڑے شوقین ہیں۔ وہ پینے سے یک گونہ بے خودی محسوس کرتے ہیں۔ ان کے مطابق اگر دنیا مٹ بھی جائے لیکن ان کے ہونٹوں سے ان کا پیمانہ ہرگز جدا نہیں ہو سکتا ہے بلکہ خمریات کے موضوع پر وہ جگر کی طرح اپنا ایک الگ نظریہ رکھتے ہیں مثلاً :-

مے خانے میں یک لمحہ فرصت کسے حاصل
اے شیخ یہاں قصہ ترا کون سنے گا

حضرت واعظ بلا سے وعیظ فرماتے ہیں
میرے ہونٹوں سے کبھی ہوگا نہ پیمانہ الگ

شیخ بھی ناخوش ہے اے عابد برہمن بھی خفا
اور میں ناراض سے ہیں مے خانہ الگ

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بے خودی میں اس طرح چھلکا گئے پیمانہ ہم
ہو گئے ہیں باعثِ صد رونقِ مے خانہ ہم

"شمیمِ گل" میں بہار غزل کی طرح ہلکے پھلکے اشعار بھی ملتے ہیں لیکن عابد کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے فکر و فن پر کبھی کوئی آنچ نہیں آنے دی۔ وہ مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں بھی سلاست اور روانی پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین "شمیمِ گل" پر تبصرہ کرتے ہوئے عابد کی شاعری کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

"عابد نے ہلکے پھلکے اشعار کہے ہیں۔ اُن کی خوبی یہ ہے کہ ان میں بڑی صفائی روانی اور بندش کی چستی پائی جاتی ہے۔ اس نوعمری میں الفاظ کی ترتیب کو اس خوش اسلوبی سے نبھانا قابلِ داد ہے۔ وزن اور قافیے کی قیود نے بھی انھیں تعقیدِ لفظی پر مجبور نہیں کیا۔ ہر بات بڑی قدرت کے ساتھ کہتے ہیں۔"[1]

"شمیمِ گل" میں چند نظمیں بھی ملتی ہیں۔ ان نظموں میں بھی خاص انفرادیت جھلکتی ہیں۔ تو کہیں وہ تو نہیں، کلرک کی روداد، گیتانجلی سے، رنگ و مستی، کس کے نام، شبِ غم، شکوہ اہلِ اردو، دعوتِ جہد، اے مادرِ ہندوستان، وقت، سسکیاں، آہ نورِ نوری، معذور، ہم لوگ، دعوتِ فکر و عمل، اعتراف، میرا وطن، صرف چند نظمیں ہیں جن سے عابد کا ایک اور رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ اگرچہ عابد نظم کے شاعر نہیں لیکن پھر بھی اُن کی نظمیں بڑی جاندار ہیں اور فکر و نظر کی دعوت دیتی ہیں۔ ان نظموں میں عابد کا خلوص جگہ جگہ ٹپکتا ہے۔ وہ حقائق دریافت کرنے میں اور اُن کو بروئے کار لانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔ ان میں سے بعض نظموں کا موضوع تضاد اور ٹکراؤ ہے۔ یہ تضاد اور ٹکراؤ امیر غریب، کسان، مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان ہے۔ جس کو عابد نے بڑی خوبی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ بعض نظمیں غزل کے فارم میں ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم) ان نظموں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"عابد بھی اکثر نوجوان سخن سنجوں کی طرح ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر ہیں۔ کچھ نظموں میں اُن کے یہاں امیر و غریب، کسان و مزدور اور

۱۔ "شمیمِ گل"، عابد مناوری، ص ۲۳

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سرمایہ دار کی زندگی کے تضاد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔"[۱]

کلرک کی رُوداد عابد کی ایک نمائندہ نظم ہے۔ اس میں عصری آگہی کا عرفان ملتا ہے۔ اس نظم میں مفلسی اور لاچاری کی پوری داستان منقش ہے۔ ایک کلرک کے لباس میں عابد اس نظم کے ذریعے سے تمام ملازم طبقہ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ ایک طنزیہ نظم ہے۔ وہ سماج کے کھوکھلے نظام پر طنز کرتے ہیں۔ نظم کے درج ذیل اقتباسات عابد کے اس نظریئے کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں۔ ملاحظہ ہوں:۔

عادتاً آپ غم اُٹھاتے ہیں — لوگ تقدیر خود بناتے ہیں
لیجئے گا یہ نوٹ دس کا ہے — کیس میرا ابھی دو برس کا ہے
آپ سلجھائیں گے اگر اس کو — آپ کو دوں گا دس کا اور دو

شام کو جب میں نکلا دفتر سے — دل میں دلچسپ سے ارادے تھے
پہلے سوچا کہ بار میں جاؤں — جام و مینا سے دل کو بہلاؤں
اور مس ناز کا سنوں گانا — میں وہیں کھاؤں رات کا کھانا
نو بجے فلم ہی کوئی دیکھوں — رات بارہ بجے میں گھر پہنچوں

پھر خیال آیا کیوں نہ گھر جاؤں — اور بیوی کو ساتھ لے آؤں
وہ بھی خوش بخت سیر کر لے گی — دونوں ہوں گے تو خوب گزرے گی
گھر کا سامان کچھ خریدوں گا — خرچ کر کے فضول کیا لوں گا
جو ضرورت کے وقت کام آئیں — ایسے پیسے فضول کیوں جائیں

'شکوۂ اہلِ اردو' عابد کی ایک اور نمائندہ نظم ہے۔ یہ بظاہر ایک طنزیہ نظم ہے جس میں عابد اردو زبان کو مشترکہ تہذیب اور کلچر کی علامت قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اردو کی تعلیم اور تدریس سے ہمارا نظام رنگوں سے بھر گیا ہے۔ اردو والوں نے اس زبان سے زندگی کے حسن کو اور بھی دوبالا کیا ہے لیکن افسوس کہ موجودہ دور میں اس زبان سے پیار اور محبت کرنے والے ہی معاشی بدحالی، مفلسی اور لاچاری کی چکی میں پس گئے ہیں اور قسم قسم کی مشکلات اور مصائب کا شکار ہو گئے ہیں۔ اپنے خیالات کا اظہار مؤثر ڈھنگ سے کرتے ہوئے عابد کہتے ہیں:۔

[۱] کشمیر میں اردو (تیسرا حصہ)، پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم)، ص ۱۳۸۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

خلوصِ شوق سے خونِ دل و جگر کے ساتھ
نئی حیات کے خاکوں میں ہم نے رنگ بھرا
ہزار حیف! ہمیں یہ صلہ دیا تم نے
ہمیں سے مکر و تغافل ہمیں پہ ظلم و جفا

دعوت جہد، اے دلِ زار، وقت وغیرہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں تکرار اور تصادم کی کیفیتیں ہر جگہ ملتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عابد خود اس انتشار اور کشمکش میں گرفتار ہوئے ہیں۔

کشمیر کی خوبصورتی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اُردو شعراء کے ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ جنہوں نے اپنی تخلیقات کے حوالے سے کشمیر کے حسن کو خراج پیش کیا ہے۔ عابد جیسے فنکار بھلا خاموش کیسے رہ سکتے ہیں۔ انھوں نے بھی اس موضوع پر طبع آزمائی کی اور "میرا وطن" کے نام سے ایک قابل قدر نظم لکھی۔ وہ اپنے مادرِ وطن پر فخر کرتے ہیں اور اس کے حسن کی تعریف کرنے میں رطب اللسان ہیں۔ دیکھئے کس طرح نظم کا آغاز کرتے ہیں:۔

اس پہ حیران ہو کر اکثر دوست کرتے ہیں سوال
ہم کو بھی تو یہ بتا، ہے کون سا تیرا وطن
کون سی وہ سرزمیں ہے ہم ذرا یہ جان لیں
جس کی مٹی نے نکھارا ہے تیرا یہ فکر و فن
کون سی وہ وادیٔ گلپوش ہے یہ تو بتا
جس کی رعنائی میں چمکا ہے ترا رنگِ سخن
دوست جب یہ پوچھتے ہیں فخر ہوتا ہے مجھے
تمکنت سے کہتا ہوں کشمیر ہے میرا وطن

"شمیمِ گل" میں چند قطعات اور رباعیات بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ یہ بھی نگارنگ موضوعات پہ دال ہیں۔

"برجستہ" عابد کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے۔ یہ سنہ ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں سنہ ۱۹۷۱ء سے لے کر سنہ ۱۹۸۲ء تک کا کلام شامل ہے۔ برجستہ کی غزلیں نہ بہارِ غزل کی غزلوں کے رنگ میں ہیں اور نہ شمیمِ گل کی — بلکہ ان کا اپنا ایک رنگ اور خوشبو ہے عابد

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

نے اگرچہ روایتی شاعری سے شعر گوئی کا آغاز کیا لیکن 'برجستہ' تک آتے آتے وہ تخلیق کے بہت سے مراحل سے گزر چکے ہیں۔ وہ جدید شاعری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے وہی رنگ اور روش اپنائی جو اُن کے معاصرین اختیار کر چکے ہیں لیکن یہاں بھی انھوں نے جُداگانہ راستہ اختیار کیا۔ برجستہ کی بعض غزلوں میں خلیل الرحمن اعظمی، شہریار، بانی اور وزیر آغا کا رنگ بخوبی پہچانا جاسکتا ہے۔ عابد کے ان شعروں پر غور کیجیے تو آپ کو خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس حد تک اپنے ان معاصرین سے متاثر ہو چکے ہیں۔ مثلاً۔

پہلے خود آگ لگا دی گھر کو	خود ہی اب محوِ تماشا ہوں میں
کیا کہوں میں کس امتحان میں تھا	قید خود اپنے ہی مکان میں تھا
بوند مانگی تو سمندر پایا	پھر بھی حیرت ہے کہ پیاسا ہوں میں

کھیت بنجر، پیڑ ننگے، سب کنوئیں بے آب ہیں
جب سے پکے ہو گئے گاؤں کے کچے راستے

کوئی اُمید کا تنکا نظر نہ آئے مجھے
کہیں یہ اندھا سمندر نگل نہ جائے مجھے

اپنی ہی بات لگتی ہے خود بھی گراں مجھے
ہر دن بدلنا پڑتا ہے اپنا بیاں مجھے

چاروں طرف فضا میں ہے بکھرا ہوا دھواں
اِس چمنیوں کے شہر میں تازہ ہوا کہاں

یہ اشعار عابد کی شاعری کے فنی جہتوں کا اعلان کرتے ہیں۔

برجستہ کی غزلیں علامتوں سے مالا مال ہیں۔ اس میں عابد نے زمانے کے درد و کرب کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ کہیں کہیں اُن کا لہجہ طنزیہ بھی ہو گیا ہے لیکن اُن کے مخصوص لہجے اور دلکشی سے یہ طنز لطیف احساس کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ برجستہ میں عابد نئی صباحتوں کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ یہ غزلیں شبنم سے دُھلے ہوئے پھول کی مانند اپنی تازگی بکھرتی ہوئی قاری کو خوش آمدید کہتی ہیں۔ ان میں جہاں فکر و خیال کی بلندی ہے وہاں نغمگی اور لوچ برابر ملتی ہے۔ عابد جذبے کے شاعر ہیں۔ وہ ہر وقت نئے جذبات کے ساتھ جلوہ افروز ہوتے ہیں اور نت نئے انداز کو برتنے [illegible]

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE 2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

رہتے ہیں۔ خوشنما اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی الفاظ کا استعمال اُن کی غزلوں میں کئی رنگ بھرتے ہیں ؎

میرے آنگن میں بھی اے قوسِ قزح ! اک دن اُتر
زندگی میں تیرا اک اک رنگ بھرنا ہے مجھے

عابد کے بعض اشعار میں ہندی دیومالا اور اساطیر کی پرچھائیاں بھی نظر آتی ہے۔ انہیں کرشن جی اور سری رامچندر جی سے گہری عقیدت ہے۔ عابد ایسے کئی واقعات اپنے اشعار میں پیش کرتے میں کامیاب ہوئے ہیں جن کا تعلق کرشن جی اور رام چندر جی کی سیرت پاک سے گہرا ہے۔ کئی جگہوں پر وہ بدی پر نیکی کی فتح واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ علامتی اسلوب اختیار کر کے اپنی بات کو واضح کرتے ہیں۔ عابد کبھی بھکشو بن کر چراغ جلنے سے پہلے ہی اپنی گپھا میں پہنچ جاتے ہیں اور کبھی شنکر کا دھیان کر کے وہ گنگا کو اپنی جٹاؤں میں چھپا لیتے ہیں۔ کبھی وہ سچ بولنے کی پاداش میں قابل سزا ٹھہرائے جاتے ہیں۔ اور کبھی اس دور کا سداماں بن کر کرشن کی تلاش میں در در بھٹکتے ہیں۔ کبھی راس رچانے کے لئے گوکل کا رُخ کرتے ہیں اور کبھی گوپیوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عابد کی اس طرح کی شاعری اُن کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے اور اُن کے خیالات سے لطف اندوز ہو جائیے۔

دہلیز پر چراغ جلاتے ہو کس لئے   بھکشو لیٹ کے جا بھی چکے ہیں گپھاؤں میں
ملی ہے یہ سزا سچ بولنے کی   زبان پر اَن گنت چھالے پڑے ہیں
میں اس دور کا سداماں ہوں در بہ در عابد
کہاں ہے کرشن مرا جو گلے لگائے مجھے !
پیروی گوتم کی کرنا اس قدر آساں نہیں
زندگی کو چشمِ عبرت سے کبھی دیکھا نہ کر
جن چراغوں سے اُٹھ رہا ہے دُھواں
آندھیوں سے وہی لڑے ہوں گے
اے دِل ساری دُنیا جھوٹی سارے دُنیا والے جھوٹے
بس اک پیار کا بندھن سچا باقی رشتے ناتے جھوٹے
خود اپنی ہی کستوری کی خوشبو سے بے کل   انجانے میں آہو لیکن ہر جانب بھٹکے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

دل کی نگری میں وہ پل بھر ہنسنے ہنسانے آیا تھا
جیسے گوکل میں اک چھلیا راس رچانے آیا تھا

عابد ایک حقیقی شاعر تھے۔ اُن کی شاعری میں قوسِ قزح کی طرح بے شمار رنگ اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ وہ الفاظ کی دروبست پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ اُن کے ہاں علامت نگاری، پیکر تراشی اور تشبیہات و استعارات کے ساتھ ساتھ خوشنما ترکیب بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ ابھی چند برس قبل انھوں نے لکھا تھا:

میں آندھیوں سے لڑوں گا یہ میں نے سوچا تھا
ہوا کا ایک ہی جھونکا بجھا گیا مجھ کو

لیکن افسوس کہ آندھیوں سے لڑتے لڑتے عابد خود آندھیوں کا شکار ہو گئے اور ہوا کے ایک ہی جھونکے نے انہیں ہم سے چھین لیا +

(ماہنامہ "شیرازہ" سری نگر
جلد ۳۵- شمارہ ۱۰-۹

شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی جموں اور انجمن ترقی اُردو جموں کی طرف سے یک روزہ عابد سیمنار میں ۲۴، دسمبر ۱۹۹۶ء کو شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی جموں میں پیش کیا گیا۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

امر چند ولی کاشمیری - چند یادیں

اُردو زبان و ادب نے اگرچہ ریاست جموں و کشمیر سے بہت دُور جنم لیا ہے لیکن اس میں اتنی لطافت اور شیرینی ہے کہ یہ زبان شروع سے ہی یہاں کے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہماری ریاست میں عدالتی اور دفتری زبان کا درجہ پانے میں کامیاب ہوئی۔ اس میں اتنی لوچ اور دلچسپی ہے کہ اس نے ایسے اَن گنت قلم کار پیدا کئے ہیں جنہوں نے اپنے خونِ جگر سے اس زبان کو سینچا۔ اقبال، چکبست، دیا شنکر نسیم، سرشار، تربھون ناتھ ہجر، علامہ کیفی، آغا حشر کاشمیری، آنند نرائن مُلا، راما نند ساگر، قدرت اللہ شہاب، چراغ حسن حسرت، اللہ رکھا ساغر، سعادت حسن منٹو، رتیش خاور کے ساتھ ساتھ کشمیر ہی میں رہ کر جن کشمیری قلم کاروں نے اس زبان کی آبیاری کی۔ ان میں پریم ناتھ پردیسی، دینا کرشن گردش، ملک راج صراف، نرسنگھ داس نرگس، گنگا دھر بٹ دیہاتی، دیوداشیشور، طالب کاشمیری، کشن سمیلپوری، تیرتھ کاشمیری، شام لال امیہ، شہہ زور کاشمیری، مرزا کمال الدین شیدا، شاہد کاشمیری، میر غلام رسول نازکی وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ افسوس کہ ان میں سے بہت سے قلم کاروں، شاعروں اور ادیبوں کو یکسر فراموش کیا گیا ہے اور اس طرح سے اُن کے فن پاروں پر وقت کی دھول جم گئی ہے۔ پنڈت امر چند ولی کا نام انہی فراموش شدہ قلم کاروں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

پنڈت امر چند ولی سنہ ۱۹۰۰ء میں سرینگر کے محلہ بڈی یار بالا میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد پنڈت سمسار چند ولی ریاست کے ڈائرسپلائی محکمہ میں ملازم تھے۔ امر چند ابھی آٹھ برس کے ہی تھے کہ اُن کے والد انتقال کر گئے۔ لہٰذا اُن کے بنائے ہوئے خواب ایک ایک کرکے بکھر گئے۔ بچپن عالم بے کسی میں گزرا۔ انہیں دو روپے ماہوار اُجرت پر مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے ٹینس لوائے کے طور پر کام کرنا پڑا۔ امر چند کو لکھنے پڑھنے کا بچپن ہی سے شوق تھا لیکن

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

والد کے انتقال کے بعد جب گھر پر افلاس و ناداری کے سائے منڈلانے لگے تو انہیں تعلیم کو خیر باد کہنا پڑا اور وہ ساتویں درجے تک ہی تعلیم حاصل کر سکے۔ اس کے بعد انھوں نے امر سنگھ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ (سرینگر) میں داخلہ لیا۔ یہاں پانچ سال تک بت تراشنے ڈرائینگ اور مصوری کی تربیت حاصل کرتے رہے۔ انہیں تربیت کے دوران بہترین کارکردگی دکھانے پر آٹھ روپے ماہوار وظیفہ ملتا رہا۔ اپنی محنت لگن اور صلاحیت سے وہ قلیل عرصے میں اس فن کے ماہر ہو گئے۔ تربیت سے فارغ ہونے کے بعد پنڈت جیالال کول ناظر کی سفارش پر وہ سناتن دھرم اسکول پشاور میں ڈرائینگ ماسٹر ہو گئے۔[۱] یہاں وہ ایک سال تک کام کرتے رہے پھر جگت جیت ہائی اسکول بھگواڑہ میں ۴۳ روپے ماہوار تنخواہ پر تقریباً ڈھائی سال تک اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔

پنڈت امرچند ولی کو اپنے وطن مالوف کشمیر سے گہرا لگاؤ تھا۔ ملازمت کے دوران کئی برس تک وہ وطن سے دور نہایت ہی پریشان حالی اور کسمپرسی کی حالت میں رہے آخر کچھ عرصے کے بعد انہیں ریاست جموں و کشمیر کے محکمہ تعلیم میں بحیثیت آرٹ ٹیچر تعینات کیا گیا۔ وہ پچپن ۵۵ سال تک جموں و کشمیر کے مختلف تعلیمی اداروں میں آرٹ کی تربیت دیتے رہے۔ ۱۹۵۵ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ بحیثیت آرٹ ٹیچر کے پنڈت امرچند ولی بہت مقبول تھے۔ ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد کشمیر کے مختلف غیر سرکاری تعلیمی اداروں نے اُن کی خدمات حاصل کرنے کے لئے اُن سے رجوع کیا۔ وہ نو ۹ برس تک ڈی۔ اے۔ وی اسکول رعناواری میں کام کرتے رہے۔ ولی صاحب ۱۹۸۰ء میں اسی ۸۰ سال کی عمر میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

امرچند ولی اپنے دور کے ایک اچھے سخن ور تھے۔ قلیل تعلیم کے باوجود بھی وہ اُردو، کشمیری اور فارسی زبان و ادب پر دسترس رکھتے تھے۔ وہ اُردو کے ساتھ ساتھ کشمیری میں بھی شعر کہتے تھے۔ کشمیری میں اُن کا ایک مجموعہ 'میخانۂ ولی' کے نام سے زیورِ طبع سے آراستہ ہو رہا ہے۔ اُن کی اُردو شاعری بھی پڑھنے کی چیز ہے۔ غزل، نظم، قطعہ، رباعی، مخمس، ترجیع بند وغیرہ جیسے اصناف پر ولی صاحب کو پوری گرفت حاصل تھی۔ انہوں نے دیوانِ غالب کا کشمیری میں منظوم ترجمہ کیا ہے جو عنقریب ہی شائع ہو رہا ہے۔

---

[۱] ولی مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ تحریر جو راقم السطور کے پاس محفوظ ہے۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

انہوں نے غالب اقبال اور جگر کے اشعار پر تضمینیں بھی لکھی ہیں۔ ولی صاحب نے شریمد بھاگوت گیتا کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے جو پڑھنے کی چیز ہے۔ انہوں نے یوگ اور سائنس پر بھی ایک کتاب لکھی ہے جو غیر مطبوعہ ہے۔

ولی صاحب بچپن سے ہی موسیقی سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ مختلف منڈلیوں اور محفلوں میں موسیقی کے ساتھ ساتھ وہ اپنی آواز سے بھی جادو جگاتے تھے اور معاشرے میں عزت و توقیر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ ولی کے پسندیدہ اور محبوب شعراء میں غالب کا نام سر فہرست ہے۔ وہ بچپن سے ہی ان کی غزلیں ہارمونیم پر گایا کرتے تھے۔ ان کی غزلوں کو ساز اور آواز دے کر ان کی طبیعت شعر و شاعری کی طرف مائل ہوئی۔ علم عروض کی جانکاری بھی انہیں غالب کے کلام کا مطالعہ کرنے سے حاصل ہوئی۔ وہ شاعری میں خیالات کے ساتھ ساتھ وزن اور بحر کے بھی زبردست قائل تھے۔ چنانچہ خود ایک جگہ پر لکھتے ہیں:-

"جس شاعری میں سنگیت نہ ہو اور جس سنگیت میں شاعری نہ ہو، وہ ادب عالیہ نہیں ہے۔ میری شاعری سنگیت سے شروع ہوگئی ہے۔ میں غالب کی غزلیں ہارمونیم میں بجایا کرتا تھا۔ اسی سے میری شاعری کی ارتقا ہوئی۔" [1]

ولی کی شاعری رنگا رنگ موضوعات پر دال ہے۔ انہوں نے روایتی رنگ کو بھی اپنایا ہے اور نئے نئے خیالات کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ شاعری میں وہ غالب، اقبال اور حالی سے خاص طور پر متاثر تھے۔

ولی مرحوم کے کلام کا دور متعین کرنا مشکل ہے کیوں کہ ان کی کسی بھی دستیاب تخلیق پر کوئی بھی تاریخ درج نہیں ہے۔ البتہ رسائل و اخبارات کے پرانے فائل دستیاب ہونے پر اس کی نشاندہی ہو سکتی ہے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں عام طور پر ماہنامہ "تعمیر" (سرینگر)، روزنامہ "مارتنڈ" (سرینگر)، "جیوتی" (سرینگر)، ماہنامہ "شیرازہ" (سرینگر) اور "ہمارا ادب" (سرینگر) کے پرانے شماروں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ولی صاحب کے بیشتر فن پارے مسودات کی شکل میں ان کے لواحقین کے پاس محفوظ ہیں جن کو شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

ولی صاحب ایک درویش صفت انسان تھے۔ انہیں شروع سے ہی ویدانت

---

[1] ولی مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ تحریر سے۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سے خاصی دلچسپی تھی جس کی جیوت اُن کے دل میں شری گنیش داس جی نے جلائی تھی جو کہ اُن کے مرشد تھے۔ ولی (مرحوم) اگرچہ ہندو دھرم پر اعتقاد رکھتے تھے لیکن ہر ایک مذہب کا احترام کرنا اُن کا شیوہ تھا۔

ولی اپنے دور کے ایک اچھے شاعر تھے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی رباعیات بھی اور قطعات بھی۔ لیکن غزل اور رباعیات میں اُن کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ ولی کی غزل میں جہاں ایک طرف حسن و عشق کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے وہاں دوسری طرف ہجر و وصال کے مضامین بھی بڑے لطیف انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ اُن کی غزل نہ صرف انہی جذبات و احساسات کی ترجمان ہے بلکہ اس میں انسان کے دردو کرب کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔ اُن کی غزلوں میں حزن و ملال کے جذبات کے ساتھ ساتھ حیات و کائنات کے مسائل بھی اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم) ولی کی غزل میں بیان کا لطف اور اسلوب کی چاشنی محسوس کرتے ہیں۔ انہیں اُن غزلوں میں جدید عصری رجحانات کی جھلک بھی دیکھنے میں آتی ہے چنانچہ اپنی کتاب میں ولی کی شاعری کی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ولی کی غزل میں بیان کا لطف اور اسلوب کی خوبی خاص طور پر نمایاں ہے اور غزل کی روایت کی پابندی کے ساتھ ساتھ جدید عصر کے رجحانات کی جھلک بھی اس میں ملتی ہے۔ ولی کی طبیعت میں ایک دبا دبا سا مزاج بھی ہے جو اُن کی غزل کو دلچسپ بنا دیتا ہے۔" [1]

سروری صاحب کے اس بیان میں کوئی مبالغہ نہیں۔ انہوں نے ولی مرحوم کی غزل گوئی کی صحیح تصویر پیش کی ہے۔ ولی کی غزل کی انفرادیت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی محسوس کرتے ہیں، اسی کو الفاظ میں ڈھال کر شعر کی صورت میں پیش کرنے کے روادار ہیں۔ مثلاً:۔

برق بن کر جو جلاتا اے جنونِ نارسا
ایک قطرہ آنسوؤں کا بھی شرارا نہ ہوا

کیا بات تھی بگڑ کے یہ کیا بات ہو گئی — دن وصل کا تھا ہجر کی کیوں رات ہو گئی

---

[1] کشمیر میں اردو (دوسرا حصہ) پروفیسر عبدالقادر سروری ص ۳۲۶

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

شبِ فرقت ہیں داغِ ہجراں — ہوا ہے دیدہ دل میں چراغاں
وقتِ عشرت دے کے بدلے ساقیا — پی رہا ہوں جامِ انجم رو دیا کیے
نشیمن شاخِ گل پہ اب کہاں ہیں — نہیں میرا کہیں اب آشیاں ہے
جمہور کی سحر سے نئی ضوفشاں کرن — پھوٹی تو نذرِ گردشِ حالات ہو گئی

ولی مرحوم کی زندگی غم والم کی داستان ہے۔ وہ چھوٹی سی عمر میں والد کے سایۂ شفقت سے محروم ہو گئے۔ جوان ہوئے تو روزگار کی چکی میں پس گئے۔ شادی ہوئی تو رفیقۂ حیات نصف راستے پر ہی ساتھ چھوڑ گئی، پھر یکے بعد دیگرے اُن کے بچوں کی موت واقع ہوئی یعنی انھوں نے جس راہ سے بھی چلنے کی کوشش کی ناکامیوں اور محرومیوں نے گھیر لیا لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری بلکہ اُن مصائب کا ہنس ہنس کر مقابلہ کیا جو اُن کے راہ میں حائل ہو رہے تھے۔ اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں ؎

ابتدا میں مفلسی تھی انتہا میں بے کسی — درمیاں مفلسی و بے کسی تھی بے بسی
غم غلط کرنے کو ہم نے چن لیا اُلفت کا غم
جذبۂ اُلفت نے آخر ہم کو بخشی بے حسی

اس ضمن میں اُن کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں جن میں تلخی بھی ہے اور محرومی بھی حسرت بھی ہے اور مایوسی بھی درد بھی ہے اور کسک بھی ؎

ہجومِ یاس بھی ہے ولولے بھی — انہی کا رواں در کارواں ہے
پیے ہیں خونِ دل کے جام رنگیں رات بھر ہم نے
خمارِ غم کے موجوں کو بھلا میخوار کیا جانیں
گرم آنسوؤں سرد آہوں اور نالوں کے سوا!
زندگی کا ایک لمحہ بھی گزارا نہ گیا
مرے زخمِ جگر دیتے تصور کیا گلستاں کا
ہوئے ہیں داغِ دل روشن چراغاں ہے دبستاں کا

ولی کی غزلوں کا ایک اہم موضوع عشق ہے۔ اُن کی غزلیں پڑھ کر اُن کے عشق کا واضح تصور آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اُن کے مطابق عشق کا میدان بہت وسیع اور دشوار گزار ہے جس کو سر کرنا آسان بات نہیں۔ ولی اس میدان کو پار کرنا چاہتے ہیں لیکن منزلِ مقصود

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تک پہنچنے سے محروم ہیں۔ اس حال میں بھی وہ مایوس نہیں ہوتے بلکہ صبر و تحمل سے کام لیتے ہیں۔ وہ آنسو بھی بہاتے ہیں اور مشکلات کا ہنس ہنس کر مقابلہ بھی کرتے ہیں لیکن ہمت نہیں ہارتے بلکہ اُن کی جستجو جاری ہے۔ مثلاً امت

عشق میں ہم کو ہلا کیا اے وَلی
ہر قدم پر ہم صنم زد یا کیئے

عشق میں ہر گام پہ ہنس ہنس کے رد یا ہم نے
خونِ دل سے داغِ دل ہر بار دھویا ہم نے

فروغِ حُسن سے روشن ہوا ہے عشق کا عالم
ظہورِ حُسن کی نزہت دلِ پندار کیا جائیں

عمر گزاری عشق کے مذہب میں روتے روتے
پر نہ آیا ہے ابھی داغوں کو خنداں ہونا

وَلی کی غزلوں میں موضوعات کی کمی نہیں۔ اُن کے ہاں دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ ایسے بھی موضوعات ملتے ہیں جن سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ویدانت سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وَلی صوفیوں، سنتوں اور فقیروں سے لگاؤ رکھتے تھے۔ خود بھی ایک درویش صفت آدمی تھے اور گرو گنیش جی کے قدموں میں روحانی درس حاصل کر چکے تھے۔ گرو جی کی صحبت میں رہ کر اُن کی نگاہیں کھل گئی تھیں۔ وہ ظاہر و باطن کا فرق جاننے لگے تھے۔ اُن کی شاعری میں بھی نمایاں تبدیلی رونما ہوتی محسوس ہوتی ہے، کہتے ہیں ؎

سوزِ آدم زندگی ہے نورِ عالم بندگی
بندگی ہی زندگی ہے سوزِ آدم زندگی

میں ہی بندہ میں خدا تھا مجھ کو معلوم نہ تھا
میں ہی خود ذات بقا تھا مجھ کو معلوم نہ تھا

لوگ کے آئینہ خانے میں ہوا جب جلوہ گر
میں ہی بندہ میں خدا تھا مجھ کو معلوم نہ تھا

حق و باطل کا تماشا مجھ میں جب تھا یہ مخفی
میں ہی دنیا میں ہی عقبیٰ مجھ کو معلوم نہ تھا

عالم فانی ہے دنیا کیا روانی ہے یہ دنیا
ہے یہ آنی جانی دنیا اک کہانی ہے یہ دنیا

امر چند وَلی کی نظمیں بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔ ان میں چھوٹی اور مختصر نظمیں بھی ہیں اور طویل نظمیں بھی۔ یہ نظمیں قومی او رملی موضوعات پر بھی ہیں اور سیاسی اور سماجی موضوعات پر بھی۔ بعض نظموں میں حب الوطنی کے جذبات ملتے ہیں۔ عام موضوعات پر [illegible] بعض نظمیں

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بہت ہی دلچسپ ہیں۔ دردِ غم، وہم، میکدہ، تحفۂ غم، انجام سحر، گیان امرت، ہلال چاند، شوراتری، عقیدت کے پھول، تمنا، سفر، مرحوم دل، ایک شام وغیرہ جیسے موضوعات پر کہی گئی ولی صاحب کی نظمیں خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان نظموں میں جہاں غمِ دوراں و غمِ جاناں کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں وہاں ان میں بیسویں صدی کے انسان کا دردوکرب کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔

ولی نے صوفیوں اور سنتوں پر بڑی اچھی نظمیں لکھی ہیں۔ یہ نظمیں اُن کی شاعری کا ایک اور پہلو نمایاں کرتی ہیں۔ للی ایشوری، وویکانندجی، شری سوامی رام تیرتھ، گرودیو رام چندرجی، کرشن جی وغیرہ کی شخصیات اور اُن کے روحانی کمالات پر ولی نے اپنی نظموں میں بھرپور روشنی ڈالی ہے اور سنجیدگی سے ان صوفیوں اور سنتوں کا اپنے مؤثر انداز میں جائزہ لیا ہے۔ ان نظموں میں اگرچہ فکر کا عنصر تلاش کرنا عبث ہے لیکن پھر بھی ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ولی کی نظموں میں اقبال کا آہنگ بخوبی پہچانا جاسکتا ہے۔ وہ غالب کے ساتھ ساتھ اقبال سے بھی گہری عقیدت رکھتے تھے۔ اقبال کے بعض موضوعات انہیں اس قدر عزیز تھے کہ وہ ان پر خوشہ چینی کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ آفتاب، انسان، زندگی، تنہائی، شاعر، ایک شام، شکوہ، پیام، چراغ، انجام سحر، ہلالِ عید وغیرہ جیسے اقبال کے عزیز ترین موضوعات پر ولی مرحوم نے بھی نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں میں اقبال کا آہنگ جابجا ملتا ہے۔

اک خدا ہے اک خدائی ایک یہ انسان ہے
عالمِ حیرت میں غلطاں کیوں ابھی انسان ہے
ہے عبوری دور میں آدم بھی انسان ہے
مجلسی حیوان ہے یہ اس لئے شادان ہے
ہیں کتابوں میں تری جنگ و جدل کی داستان
ہے ہوس کی کشمکش سود و زیاں کی استان

(انسان)

عشق کے سرتاج تم تھے وجد کے تھے بادشاہ
عالمِ مستی کے سوامی تم بنے تھے درس گاہ

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

موجزن گنگا میں ہو کر قطرۂ بیتاب تو

گا رہے تھے ہم سو سوہم ہو اللہ ہو ہو اللہ

عالمِ وجدان کا اُن پہ پڑا تھا وہ اثر

مست وہ بھی ہو گئے تھے حور و غلماں مہر و ماہ

اک کرشمہ ہے نفیِ ہستی تماشا خانقاہ

راز محرم ہو گئے تھے رازِ غم کے بادشاہ

(سری سوامی رام تیرتھ جی مہاراج)

رات کے آغوش میں بیدار آوارہ ولی

شاعری سے کر رہا ہے دردِ دل کی دلبری

انکشافی راز میں پرواز میں سوئے عدم

جا رہا ہے چاک کر پرواز کی پردہ دری

چاند کی کھیتی میں بوتا ہے کواکب ہر گھڑی

عزلتِ شب میں یہی ہے دردِ دل کی پروری

(شاعر)

اگرچہ ولی نے غزل اور نظم کے ساتھ ہی ساتھ رباعیات اور قطعات پر بھی خاص توجہ کی ہے۔ یہ رباعیات اور قطعات کافی تعداد میں اُن کے غیر مطبوعہ کلام میں ملتے ہیں۔ ان میں ایک خاص قسم کا رنگ جھلکتا ہے۔ ولی صاحب کی بعض رباعیات محبت اور اخوت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں اور جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہیں۔ ان میں غمِ دوراں اور غمِ جاناں کی مرقع کاری بھی ملتی ہے اور ان کے درد و کرب کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔ ولی اپنے رباعیات کے بارے میں خود رقمطراز ہیں:۔

شاعری کی ارتقا ہو کر ہوئی ہے مختصر

میری غزلیں میری نظمیں رباعیاں ہو گئیں

ولی اگرچہ بات کہنے کا پرانا انداز رکھتے ہیں۔ وہ کبھی کبھی مشکل الفاظ کا سہارا بھی لیتے ہیں۔ دور از کار تراکیب کا بھی۔ یہ عمل اُن کی غزلوں اور نظموں کے ساتھ ہی ساتھ اُن کی رباعیات میں بھی ملتا ہے لیکن ولی کی غزلوں اور رباعیات میں ہی اُن کے فن کا اصل جوہر دیکھا جا سکتا ہے۔

(ماہنامہ "تعمیر" سری نگر۔ جلد ۲۷۔ شمارہ ۱۰۔ اپریل مئی ۱۹۹۷ء)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

پریم چند کا آرٹ

منشی پریم چند اردو اور ہندی افسانہ نگاری کے پیش رو ہیں۔ اُن کا فن اُس زمانے میں جوان ہوا جب جنگِ عظیم شباب پر تھی اور دُنیا کے بیشتر ممالک کے ساتھ ساتھ ہندوستان بھی اس کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ پریم چند کے ادب نے آگ کی چنگاریوں میں جنم لیا تو بے جا نہیں ہوگا۔ یہی چنگاریاں آگے چل کر شعلوں میں تبدیل ہوگئیں۔ منشی پریم چند نے اپنا ادبی سفر ایک رومان نگار کی حیثیت سے شروع کیا۔ وہ ابتداء میں راجپوتوں کی راست بازی، ویدک ہندو تہذیب، آریہ دھرم اور اس طرح کے دوسرے موضوعات پر قلم چلاتے رہے۔ چنانچہ پریم پچیسی، خوابِ خیال، خاکِ پروانہ وغیرہ میں اس قبیل کی کہانیاں ملتی ہیں۔ جو زندگی کے حقیقی مسائل کے بجائے عشق و عاشقی کے راگ الاپتی ہوئی نظر آتی ہیں لیکن رفتہ رفتہ وہ رومان کی سرحدوں سے نکل کر حقیقی دنیا میں آگئے اور اپنی خداداد صلاحیت سے اُردو افسانے کی تاریخ میں انفرادی مقام متعین کیا۔ وہ بنیادی طور پر اپنی لافانی تحریروں سے ظلم و تشدد کا قلع قمع کرنے، لاچار اور بے بس عوام کے پامال حقوق بحال کرنے، سامراجی اور جاگیردارانہ نظام کے جور و استبداد کے خلاف آواز بلند کرنے کے ساتھ ساتھ ملک و قوم کی حفاظت کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے انوکھے انداز سے اپنی کہانیوں اور ناولوں میں ان تمام چیزوں کی تصویر کشی کی ہے۔

منشی پریم چند کا خاندانی نام دھنپت رائے ہے۔ اُن کے والد منشی عجائب لال متوسط طبقہ کے ایک فرد تھے۔ وہ محکمہ ڈاک میں پچیس روپے ماہوار پر کلرک تھے۔ انھوں نے دھنپت رائے کو بڑے ناز و نعیم سے پالا تھا۔ انھیں اپنے تمام خوابوں کی تعبیریں اپنے اسی بچے میں نظر آنے لگی تھیں۔ پریم چند کے تایا انھیں نواب کہہ کر پکارتے تھے۔ اسی لئے منشی جی کی ابتدائی تحریریں نواب رائے کے نام سے ملتی ہیں۔ منشی پریم چند کی ولادت بنارس کے ایک

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

دُور دراز دیہات لمہی پانڈے پور میں ۳۱ جولائی سنہ ۱۸۸۰ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے دیہات میں ہی حاصل کی۔ سنہ ۱۸۹۸ء میں سیکنڈ ڈویژن میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ پڑھنے لکھنے کا شوق اس قدر دامن گیر تھا کہ افلاس اور ناداری کے باوجود بھی انھوں نے سنہ ۱۹۱۹ء میں بی۔اے بطورِ پرائیویٹ اُمیدوار کامیاب کیا۔ اس طرح سے اُن کا ذہن اور کشادہ ہوگیا اور وہ نئے طرزِ عمل سے سوچنے لگے۔ دھنپت رائے ابھی صرف آٹھ سال کے تھے کہ اُن کی والدہ سورگباش ہوگئیں۔ اس طرح سے وہ بچپن میں ہی ماں کی ممتا سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئے۔ پریم چند کے والد نے کچھ عرصہ کے بعد دوسری شادی رچائی لیکن پریم چند سوتیلی ماں سے اپنی حقیقی والدہ کا پیار نہ پا سکے۔ ان کی کئی کہانیوں میں اس کی بازگشت سُنائی دیتی ہے۔ ابھی یہ گھاؤ مکمل طور پر مندمل بھی نہ ہوا تھا کہ اُن کے والد چند ماہ کی علالت کے بعد انتقال کر گئے اور گھر گرہستی کا سارا بوجھ منشی جی کے نازک کندھوں پر آن پڑا۔ اس طرح سے انہیں زندگی کو سمجھنے اور حقائق کو جھیلنے کا موقعہ میسر ہوا۔ پریم چند جب پندرہ برس کے ہوئے تو اُن کی شادی رچائی گئی۔ اُن کی گھریلو ذمہ داریوں میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ انھوں نے ملازمت کے لئے ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنا شروع کئے۔ آخر ایک سکول میں اٹھارہ روپے ماہوار تنخواہ پر اسسٹنٹ ماسٹر مقرر ہوئے بعد میں انسپکٹر آف سکولز بنائے گئے۔ پریم چند کی ازدواجی زندگی ناخوشگوار رہی۔ اپنی سوتیلی ماں اور بیوی کے روز کے جھگڑوں سے اُن کا دل اُوب گیا تھا۔ وہ خود شریف النفس تھے اور ان ہنگاموں سے دُور رہنا چاہتے تھے۔ ابھی وہ اس کا علاج سوچ ہی رہے تھے کہ اُن کی بیوی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گھر چھوڑ کر چلی گئیں۔ کافی انتظار کرنے کے بعد انھوں نے ایک بال ودھوا شیورانی کے ساتھ دوسری شادی رچائی۔ یہ شادی بڑی سودمند ثابت ہوئی۔ شیورانی جی کے آنے سے پریم چند کے گھر میں ایک نئی بہار آئی اور اُن میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوا۔ لیکن تنگ دستی اور ناداری شاملِ حال رہی۔ ملازمت کے دوران انھیں بہت سے پاپڑ بیلنا پڑے۔ کبھی حکومتِ زمانہ کے خلاف لکھنے کی پاداش میں انھیں دُور دراز علاقوں میں تبدیل کر دیا گیا اور کبھی نااہل افسروں کا پول کھولنے پر اُن کی طلبی ہوئی۔ کبھی وہ مختلف بیماریوں کا شکار ہوئے اور کبھی حکومت کو اُن کی کہانیوں میں باغیانہ خیالات بکھرے ہوئے نظر آنے لگے حتیٰ کہ جب اُن کا پہلا اُردو مجموعہ سوزِ وطن کے نام سے سنہ [illegible]ء میں شائع ہوا تو اُن کی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation Chandigarh Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اشاعت سے انگریزی سرکار لرزہ براندام ہوگئی اور اس کے تمام نسخے ضبط کر کے نذرِ آتش کر دیئے گئے۔ یہ مجموعہ پریم چند کی اُٹھان کا پتہ دیتا ہے۔ چنانچہ سوزِ وطن کے شایع ہونے کے فوراً بعد انہیں انگریزی حاکموں نے طلب کیا اور کہا کہ

"تمہاری کہانیوں میں سڈیشن بھرا ہوا ہے۔ اپنی تقدیر پر خوش ہو جاؤ کہ انگریزی عملداری میں ہو۔ اگر مغلوں کا راج ہوتا تو تمہارے ہاتھ کاٹ دیئے جاتے۔ تم نے انگریزی سرکار کی توہین کی ہے۔"

لیکن وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے۔ وہ ہر وقت سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کو کاغذ پر انڈیلتے رہے اور حکومت زمانہ کے جور و استبداد کے خلاف آواز اٹھاتے رہے۔ چنانچہ جب انہیں ملازمت سے برطرفی کا خطرہ لاحق ہوا تو انھوں نے اپنے عزیز دوست دیا نرائن نگم کے کہنے پر دھنپت رائے کے بدلے اپنا قلمی نام پریم چند اختیار کیا اور سنہ ۱۹۱۰ء میں 'زمانہ' کانپور کے دسمبر کے شمارے میں پریم چند کے نام سے اُن کی پہلی کہانی 'بڑے گھر کی بیٹی' شایع ہوئی۔ وہ نشیم اور بمبوق کے قلمی ناموں سے بھی کافی عرصہ تک لکھتے رہے۔ پریم چند کا بنیادی مقصد غفلت میں سونے والوں کو بیدار کرنا تھا۔ وہ اپنے ہم وطنوں پر ڈھائے گئے ظلم و ستم برداشت نہ کر سکتے تھے۔ انگریزوں نے اس ملک میں جو آگ لگائی تھی پریم چند ہر قدم پر اپنی تحریروں سے اس کا رُخ پلٹنا چاہتے تھے اور ملک و قوم کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے اُن کی تحریروں میں ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تصویر کشی ملتی ہے۔ جون ۱۹۳۰ء کو بنارسی داس چترویدی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میری تمنا بہت محدود ہیں۔ اس وقت سب سے بڑی آرزو بھی یہی ہے کہ ہم اپنی جنگ آزادی میں کامیاب ہوں۔ میں دولت اور شہرت کا خواہش مند نہیں ہوں۔ ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ کی تصنیفیں چھوڑ جاؤں لیکن ان کا مقصد بھی حصولِ آزادی ہو.... میں بے حرکت زندگی کو بھی ناپسند کرتا ہوں۔ ادب اور وطن کی خدمت کا مجھے ہمیشہ سے دھیان ہے۔" [1]

پریم چند تحریکِ آزادی کے اُبال کی پیداوار ہیں۔ وہ ملک اور عوام کو آزاد فضاؤں

[1] بحوالہ 'شیرازہ'، سرینگر، پریم چند نمبر جلد ۲۰، شمارہ ۱، ۳۱ جنوری سنہ ۱۹۸۱ء

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

میں سانس لینے کے متمنی تھے۔ انہیں حکام نوازی اور انگریز پرستی سے شدید نفرت تھی۔ انھوں نے اُس وقت کے ہندوستان کی بھوکی اور ننگی تصویر ہمارے سامنے رکھی ہے جس پر ایک بیرونی سامراجی حکمرانی کر رہا تھا اور جس نے ہمارے ملک میں لوٹ کھسوٹ مچائی ہے اور ظلم و تشدد اور بربریت کا بازار گرم کیا ہے۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ پریم چند خود دیہات کے نچلے طبقے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنا بچپن اور جوانی انتہائی افلاس اور ناداری کی حالت میں گزاری تھی۔ اسی لئے وہ ہندوستان کے دیہی مسائل سے واقف تھے۔ انہوں نے اپنی اکثر کہانیوں کے موضوعات دیہاتوں سے لئے۔ وہ پہلے ہندوستانی فن کار تھے جن کے یہاں ہندوستان میں رہنے والے عام انسان کے احساس بغاوت کے ساتھ ساتھ محنت کش عوام کے ساتھ گہری ہمدردی ملتی ہے۔ انھوں نے اس دھرتی کی کہانیاں لکھیں اور ان انسانوں کو اپنی کہانیوں میں مرکز توجہ بنایا جو محنت کش طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پریم چند دیہاتی مسائل سے بخوبی واقف تھے۔ اپنی کہانیوں میں انھوں نے دیہاتوں سے ہی خام مواد حاصل کیا چنانچہ دیہات کے لوگوں کی سیدھی سادی زندگی اُن کے افلاس اور ناداری اور اُن پر ہو رہے ظلم و ستم کو پریم چند نے اس طرح دردناک پیرائے میں بیان کیا ہے کہ دل بھر آتا ہے۔ پریم چند صحیح معنوں میں ایک مصور تھے۔ اُن کے یہاں سب سے پہلے ارضیت کے پہلو نظر آتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ایک سچے فن کار کی طرح لوگوں کے دکھ درد کو محسوس کرتے ہیں اور پھر اس کو کھل کر بیان کرنے کے قائل ہیں۔ ایک حقیقی فن کار کی یہی پہچان ہے۔

منشی پریم چند نے اپنی ادبی مسافت کا آغاز ۱۳ سال کی عمر میں اپنے ادھیڑ مگر کنوارے ماموں کے عشق و عاشقی کا قصہ ایک ناٹک کی شکل میں لکھ کر کیا۔ انھوں نے اپنا پہلا افسانہ ۱۸۰۷ء میں 'دنیا کا سب سے انمول رتن' لکھا جو 'زمانہ' کانپور میں شائع ہوا۔ اُن کے ابتدائی دور کے افسانوں کی زبان پر سرشار اور ٹیگور کی گہری چھاپ ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان میں داستانی رنگ بھی نمایاں ہے چنانچہ اس کی طرف خود ہی اپنے دوست دیا نرائن نگم کے ایک خط میں اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میرے طرزِ تحریر پر کسی دوسرے مصنف کے اسلوب بیان کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہے لیکن پنڈت رتن ناتھ سرشار کا زیادہ اور ٹیگور کا

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

رابندر ناتھ ٹیگور کا طرز کچھ کچھ اثر انداز ہوا ہے۔" [۱]

اس کے بعد پریم چند نے بیسیوں افسانے، ناول، مضامین اور نثر پارے لکھے۔ یہ سارا دور ہندوستان میں افراتفری، بدامنی اور انتشار کا دور تھا۔ ہر طرف بغاوت کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ہندوستان کی حالت ابتر تھی۔ عوام پر قسم قسم کے مظالم ڈھائے جا رہے تھے۔ انگریزوں نے اس ملک کے نظام کو درہم برہم کر دیا تھا۔ جاگیردارانہ نظام نے عوامی زندگی کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں اور سارا ماحول نحس نحس ہو چکا تھا۔ ان تمام واقعات کے اثرات ایک حساس فن کار کے دل اور ذہن پر مرتسم ہونا ناگزیر تھا۔ پریم چند بھی ان اثرات سے دامن بچا نہ سکے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کہانیوں اور ناولوں میں ہندوستان کی معاشی، سیاسی اور طبقاتی کشمکش کا واضح نقشہ بڑے مؤثر انداز میں کھینچا ہے۔ معروف ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:۔

"پریم چند کے ناولوں اور کہانیوں میں ان کے عہد تک کے ہندوستان کی معاشی سیاسی طبقاتی اور عوامی کشمکش کا بڑا واضح اور تابناک نقشہ ملتا ہے۔"

پریم چند کے افسانے اُردو افسانے کے ارتقا کی مُنہ بولتی کہانی ہے۔ ان میں ادب اور سماج کو سمجھنے کی واضح کوشش ملتی ہے۔ یہ جیتے جاگتے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ اِن کے مسائل ہیں ان کی خوشیاں اور غم ہیں۔ پریم چند کے افسانوں سے ہی ادب میں حقیقت نگاری کی بنیاد پڑتی ہے۔ اِن کے یہاں غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے لوگوں کی فریادیں ہیں۔ پریم چند کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے ایک عظیم فنکار کی طرح اپنے عہد میں ہونے والے ظلم و تشدد کے خلاف بغاوت کی اور پسماندہ طبقہ کی ترجمانی کی۔ انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے خطبۂ صدارت میں خود کہا ہے:۔

"ہماری کسوٹی پر وہ ادب پورا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی رُوح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو۔ جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سُلائے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔"

پریم چند بڑے حقیقت نگار تھے۔ انھوں نے اُردو ادب میں مافوق الفطرت کی کوئی گنجائش نہیں رکھی بلکہ اس کے بجائے ایسے حقائق پیش کئے جو عام زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh. Funding by IKS-MoE-2025-Grant

[۱] رسالہ "زمانہ" کانپور، پریم چند نمبر ص ۱۰۷

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ان کی نظر میں اتنی گہرائی اور بیان میں اتنی صداقت ہے کہ وہ تصویر مجموعی حیثیت سے سارے ہندوستان کی ترجمانی کر سکتی ہے۔ پریم چند نے حقیقت نگاری کی جو بنیادیں قائم کی ہیں وہ بڑی صحت مند ہیں۔ ہر بڑا ادیب اپنے عہد کے انقلاب کے کسی نہ کسی پہلو کی ترجمانی ضرور کرتا ہے اور اس اعتبار سے پریم چند کی عظمت مسلمہ ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کے انقلاب کے بنیادی سوال کو اپنے ادب کا مرکزی نقطہ بنایا اور وہ کسانوں کا سوال ہے جسے انھوں نے فنکارانہ انداز سے پیش کیا۔

پریم چند کا ادب انسانی کرداروں کا روشن آئینہ ہے۔ اُن کے یہاں نفسیاتی الجھنیں نہیں ملتی ہیں اور نہ جنسی اور اعصابی امراض کے شکار نوجوان ان کے یہاں چلتے ہوئے انسان ہیں جو بہتر انسان بننے کے خواہش مند ہیں۔ پریم چند کی کہانیاں ہمیشہ سماجی مسائل کے گرد گھومتی ہیں۔ انھوں نے فرد کو کبھی سماج اور سماجی مسائل سے الگ نہیں کیا اور یہ اُن کی حقیقت نگاری کا سب سے بڑا پہلو ہے۔ اُن کے کرداروں کے دل میں اس سماجی نظام کے خلاف صدیوں کی تلخی اور نفرت بھری ہوئی ہے جس کی بنیاد ظلم، تشدد اور ناانصافی پر قائم ہے۔ یہ کردار کسان، کلرک، اچھوت اور درمیانی طبقے کے چھوٹے چھوٹے لوگ بھی ہیں اور زمیندار ساہوکار، پولیس کا رندے اور سرکاری افسر بھی، رشوت خور بھی اور بے ایمان بھی، ظلم اور تشدد پھیلانے والے بھی اور مذہب کے نام پر لوٹ کھسوٹ کرنے والے بھی۔

اس حقیقت کو کبھی بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ پریم چند نے دیہاتی ماحول کی پوری پوری تصویر کشی کی ہے۔ اُن کے ناولوں اور افسانوں میں ہندوستان کی ہری بھری کھیتیاں ہل چلاتے ہوئے بیل، بیج بوتے ہوئے کسان، خون پسینہ ایک کرتے ہوئے مزدور، غریبوں اور مظلوموں پر ظلم و ستم ڈھاتے ہوئے جاگیردار، رشوت لیتے ہوئے جنگل کے ملازم اور مہاجن وغیرہ ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ پریم چند نے جس خوبی کے ساتھ ان مناظر اور کرداروں کو پیش کیا ہے۔ اس سے سارے ہندوستان کی زبوں حالی کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔ پریم چند نے ہندوستانی عوام کو پہلی بار زبان دی ہے۔ یہ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ ہے تحریک آزادی کو تیز تر کرنے میں ان کا حصہ بڑے بڑے رہنماؤں سے کچھ کم نہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں آزادی کے جذبے کی ایماندارانہ عکاسی کی۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی بجا طور پر لکھتے ہیں:-

ہندوستان میں تحریک وطنیت کی تاریخ مورخ کا قلم جب آج سے سو برس

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

برس کے بعد لکھے گا تو اُس کے تیس پینتیس برس کی تاریخ کے لئے جہاں گاندھی، موتی لال، جواہر لال، ابوالکلام آزاد کی تقریریں اور تحریریں پڑھنے لازمی ہوں گی وہاں پریم چند کے افسانے بھی ناگزیر ہوں گے۔"

اس سلسلے میں اُن کے بڑے بابو، بیلٹی کا دھن، زنجیریں، ستی، کرموں کا پھل، نیچ ذات کی لڑکی جیسے افسانے اور جلوۂ ایثار، بیوہ، بازارِ حسن، میدانِ عمل اور گئودان وغیرہ جیسے ناول پیش کئے جا سکتے ہیں۔ پریم چند کی ان تخلیقات میں جو کشمکش اور تصادم ملتا ہے، یہی اُن کے فن کی ایک بنیادی خصوصیت ہے۔

پریم چند نے ہندوستانی سوسائٹی کو بھی بے نقاب کر دیا ہے۔ ہمارے سماج میں جو نقائص ہیں، پریم چند نے اُن پر بھی بے باکی سے انگلی دھری ہے۔ یہاں اُن کی خدمات گاندھی جی کی خدمات سے کچھ کم نظر نہیں آتیں۔ اس سماج میں جو کھوکھلا پن ہے۔ اس کو اس عظیم فن کار نے اپنے قلم کی توانائی اور فکر کی گہرائی سے ایک انوکھا رنگ بھر کے پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں اُن کی انتقام، بازیافت، بینک کا دیوالہ، تحریک حقیقت، دُنیا کا سب سے انمول رتن، فتح، کفن، یہی میرا وطن ہے وغیرہ جیسی کہانیاں پیش کی جا سکتی ہیں۔

حق بات تو یہ ہے کہ پریم چند نے اُردو افسانے کی پہلی جیوت جلائی۔ اس چراغ سے دوسرے چراغ جلے اور آج اُردو کہانی ارتقا کے ایسے موڑ پہ آ پہنچی ہے جہاں یہ عالمی کہانی کے ساتھ آنکھ ملانے کی تاب پیدا کر سکتی ہے۔ یہ پریم چند کی سب سے بڑی دین ہے۔

'پرواز ادب' پٹیالہ
نومبر۔ دسمبر ۱۹۹۶ء

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کرشن چندر اور اُن کا تخلیقی ذہن

منشی پریم چند کے بعد جو قلم کار اُردو کے مختصر افسانے کے اُفق پر نمودار ہوئے۔ ان میں سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس، دیویندر ستیارتھی، عزیز احمد، شوکت تھانوی، کشمیری لال ذاکر وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ افسانہ نگاروں کی اسی کہکشاں میں کرشن چندر اپنا ایک ممتاز اور قابلِ قدر مقام رکھتے ہیں۔

کرشن چندر نے بے شمار افسانے، ناول اور ڈرامے لکھے۔ اپنی تخلیقات میں انھوں نے ہر طبقہ کے لوگوں کی نمائندگی کی اور اپنے فن کو زندگی کے قریب لا کھڑا کر دیا۔ وہ بڑے حقیقت نگار بن گئے۔

کرشن چندر ۲۳ نومبر ۱۹۱۳ء کو بھرت پور (راجستھان) میں پیدا ہوئے۔ اُن کا آبائی وطن وزیر آباد (پاکستان) ہے۔ اُن کے والد گوری شنکر جی پیشے سے ایک ڈاکٹر تھے۔ کرشن چندر کی ولادت کے پانچ سال کے بعد سنہ ۱۹۱۸ء میں اُن کے والد کا تبادلہ جموں سے تقریباً تین سو کلو میٹر دور ضلع پونچھ میں ہوا۔ پانچ سال کی عمر میں کرشن چندر کو ضلع پونچھ کے مینڈر پرائمری اسکول میں داخل کر لیا گیا۔ انھوں نے وکٹوریہ جوبلی اسکول پونچھ سے سنہ ۱۹۲۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے وہ لاہور چلے گئے جہاں سائنس کے مضامین کے ساتھ سنہ ۱۹۳۳ء میں بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں کرشن چندر نے انگریزی ادب میں ایم۔اے کا امتحان پاس کیا، اور سنہ ۱۹۳۷ء میں لاہور کے لا کالج سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ اقبال کی شاعری پر تحقیق کرنا چاہتے تھے، مگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

کرشن چندر شریف النفس، ملنسار اور خوش اخلاق انسان تھے۔ وہ اعلیٰ جمالیاتی ذوق رکھتے تھے۔ اُن کی گھریلو زندگی بھی سادہ تھی۔ مہمان نوازی میں اُن کا کوئی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ثانی نہیں تھا۔ انسانیت اُن کا مذہب تھا۔ انھوں نے ہر وقت اپنے قلم سے ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کی۔ وہ اشتراکیت پر ایمان رکھتے تھے۔ کرشن چندر شروع سے ہی حب الوطنی کا جذبہ رکھتے تھے۔ اُن کے دِل میں وطن دشمن عناصر کے خلاف آگ جل رہی تھی اِسی لئے وہ زمانۂ طالب علمی میں کالج سے بھاگ کر شہید بھگت سنگھ کے گروپ میں شامل ہو گئے تھے۔ اور انقلاب کے نعرے بلند کرتے رہے۔ انھیں دو ماہ کے لئے لاہور کے قلعہ میں قید کر دیا گیا لیکن جب پولیس کوئی جرم ثابت نہ کر سکی تو انھیں باعزت رہا کر دیا گیا۔

کرشن چندر کا خاندان ہرا بھرا خاندان تھا۔ اُن کے تین بھائی تھے۔ مہندر ناتھ اوپندر ناتھ اور راجندر ناتھ۔ اُن کا چھوٹا بھائی راجندر ناتھ بچپن میں ہی انتقال کر گیا تھا۔ کرشن چندر کے دوسرے بھائی اُردو کے معروف کہانی کار مہندر ناتھ تھے، وہ ۲۰ مارچ ۱۹۷۴ء میں انتقال کر گئے۔ کرشن چندر کی اکلوتی بہن سرلا دیوی جی کہانیاں لکھتی تھیں اُن کی شادی ہندی کے معروف ادیب رتی شرن شرما سے ہو چکی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں کرشن چندر کی شادی لاہور میں شریمتی ودیاوتی سے رچائی گئی۔ اُن کے تین بچے ہیں۔ رنجنا، کیبلا اور الکا۔

کرشن چندر کی ازدواجی زندگی ناخوشگوار رہی۔ انھوں نے اپنی پہلی بیوی شریمتی ودیاوتی کو طلاق دے کر ۱۹۶۱ء میں معروف خاتون افسانہ نگار سلمیٰ صدیقی سے دوسری شادی رچائی۔

کرشن چندر شروع سے ہی پڑھنے لکھنے کی طرف شغف رکھتے تھے۔ اسکول کے زمانے میں انھوں نے اپنے اُستاد ماسٹر بلاقی رام نندہ کے کردار سے متاثر ہو کر پروفیسر بلیکی کے عنوان سے ایک طنزیہ افسانہ لکھا جو سردار دیوان سنگھ مفتوں کی ادارت میں شائع ہونے والے اخبار ریاست دہلی میں شائع ہوا۔ یہ افسانہ اُس زمانے میں لوگوں نے بے حد پسند کیا لیکن اس پر اُن کے والد بہت خفا ہو گئے کہ اُن کے بیٹے نے اپنے اُستاد کا مذاق اُڑایا ہے۔ اس کے بعد کرشن چندر نے کافی عرصہ تک کچھ بھی نہ لکھا لیکن کالج کی تعلیم کے دوران اُن کے اندر کا فن کار جاگ اُٹھا اور انھیں پھر سے قلم اُٹھانے پر مجبور کیا۔ اس زمانے میں انھیں یرقان کی شکایت ہوئی صحت یاب ہونے کے بعد انھوں نے اسی عنوان کے تحت ایک افسانہ لکھا جو ادبی دُنیا، لاہور میں شائع ہو کر مقبول ہوا۔

کرشن چندر بعض انگریزی اور اُردو رسائل سے بھی منسلک رہے اور ادارتی فرائض بھی بخوبی انجام دیتے رہے۔ انھوں نے 'نیا ادب' کے ادارہ کی طرف سے شائع ہونے والے جرنل

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

"نئے زاویے" کی دو جلدیں بھی مرتب کیں۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کرشن چندر نومبر ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو لاہور میں بحیثیت پروگرام اسسٹنٹ ملازم ہوگئے۔ وہ دہلی اور لکھنؤ کے ریڈیو اسٹیشنوں میں بھی ملازمت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انھی دنوں اُن کی ملاقات شالیمار پکچرز کے مالک اور نامور پروڈیوسر ڈبلیو۔ زیڈ احمد سے ہوئی۔ وہ اُن کی صلاحیتوں سے واقف تھے۔ انھی کی ایما پر کرشن چندر شالیمار پکچرز پونا میں ملازم ہوگئے جہاں ان کے سپرد کہانیاں اور منظر نامے لکھنے کا کام رکھا گیا۔ انھوں نے بےشمار فلمی کہانیاں اور منظر نامے لکھے۔ وہ بمبئی ٹاکیز اور نیشنل تھیٹر سے بھی وابستہ رہے اور ماڈرن تھیٹر کے نام سے اپنا ذاتی ادارہ قائم کیا۔ کرشن چندر اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔ اپنے افسانوں اور ناولوں کی طرح انھوں نے اپنی فلمی کہانیوں اور منظر ناموں میں بھی نئے تجربے کئے۔ انھوں نے ادب کی طرح فلم کے میڈیم کی بھی بے لوث خدمت کی۔

کرشن چندر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ اگرچہ شروع میں انھوں نے انگریزی میں بھی متعدد مضامین لکھے جو معیاری رسائل و اخبارات میں شائع ہوئے لیکن اصل میں وہ اردو افسانہ نگاری کے مردِ میدان تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جب انھوں نے ادبی دنیا میں قدم رکھا تو اُن کا پہلا افسانہ "جہلم پر ناؤ میں" شائع ہوا۔ سب کی نگاہیں اُن پر مرکوز ہوگئیں۔ اس کے بعد کرشن چندر بے تکان لکھتے رہے۔ اُن کے ابتدائی افسانوں میں رومانیت کی گہری چھاپ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس دور کے افسانوں میں سیاست کی ہلکی ہلکی چھاپ بھی نظر آتی ہے۔ ان افسانوں میں "زندگی کے موڑ پر"، "گرجن کی ایک شام"، "نغمے کی موت"، "پرانے خدا"، اور "ان داتا" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ "ان داتا" کرشن چندر کا ایک اہم اور لافانی افسانہ ہے۔ یہاں سے کرشن چندر کا ایک اہم موڑ شروع ہوتا ہے۔ اسی افسانے سے انھوں نے سماجی حقیقت نگاری کی حدود میں قدم رکھا۔ یہ طویل مختصر افسانہ بنگال کے قحط پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اور شاید سارے اردو ادب میں اس پایہ کی کہانی نہیں لکھی گئی ہے۔ ۱۹۴۶ء سے کرشن چندر کی افسانہ نگاری کا سنہرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں انھوں نے بھارتیہ بحریہ کے جہازوں کی بغاوت سے متاثر ہو کر "تین غنڈے" اور

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہندو مسلم فسادات سے متاثر ہو کر پشاور ایکسپریس اور ہم وحشی ہیں جیسے سدا بہار افسانے لکھے کالو بھنگی اور مہالکشمی کا پل بھی کرشن چندر کے قابل قدر افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں سرمایہ دارانہ نظام اور محنت کش طبقہ کے درمیان کشمکش ملتی ہے ان کے علاوہ کرشن چندر کے بیسیوں افسانے ہیں جن میں زندگی کے حقائق کو بڑے نرالے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ایسے افسانوں میں گھونگھٹ میں گوری جلے لکڑی کے کھوکھے، جنت اور جہنم، پورے چاند کی رات، سب سے بڑا گناہ، اجنتا سے آگے کالا سورج، ٹوٹے ہوئے تارے، حسین اور حیوان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ چند افسانوں کے اقتباسات ملاحظہ ہوں جن میں عشق و محبت کی سرمستی بھی ہے۔ اور ظلم و تشدد کے واقعات بھی، فلسفہ حیات بھی ہے اور انسان دوستی اور امن پرستی کا جذبہ بھی۔ طبقاتی جد و جہد بھی ہے اور مناظر قدرت کی رنگا رنگی بھی۔

● ۔بعض سیدھے سادے لوگ خیال کرتے ہیں کہ کپڑے انسان کی خوبصورتی کو بڑھاتے ہیں۔ یہاں میں وہ دہرانا نہیں چاہتا جس کا مطلب یہ ہے کہ چاند گہنوں کے بغیر بھلا معلوم ہوتا ہے مگر میں یہ بات ضرور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ان سیدھے سادے لوگوں کا خیال بالکل غلط ہے۔ کپڑے دراصل اسی لئے پہنے جاتے ہیں کہ لوگ اپنی بدصورتی کو چھپا سکیں جس طرح روحانی بدصورتی کو لوگ خیرات سے ڈھانپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح جسمانی بدصورتی کو چھپانے کے لئے خوشنما پوشاکیں پہنی جاتی ہیں ....گلاب کی کلی، چنبیلی کا پھول، آسمان کی نیلاہٹ، شفق کا حسن، اگر ان تمام چیزوں کو کپڑوں کی ضرورت نہیں تو کیا صرف انسانی حسن کو کپڑوں کی حاجت ہے؟

(ننگے تم ہنسنے پر)

● ۔ندی کے کنارے سے آنگی کسی بے فکر ہرنی کی طرح قدم رکھتی ہوئی آرہی تھی۔ کاندھے پر تیلی سی سونٹی تھی، لبوں پر ایک بے معنی سا گیت، پاؤں ننگے تھے، لیکن چال پر ایک خاموش موسیقیت کا شبہ ہوتا تھا۔ مسافر نے اپنی کتاب بند کر دی اور آنگی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ کاش وہ مصور ہوتا۔ کتنی خوبصورت تصویر ہے کتنا دلکش منظر! آنگی کے سڈول مگر مضبوط بازو، اس کی کمر کا متناسب خم اچھا تو وہ سنگتراش ہی ہوتا۔ دنیا میں کسی کی آرزوئیں پوری نہیں ہوتیں۔ ورنہ وہ مجسمہ تیار کرتا کہ یونانی صنم گر بھی شششدر رہ جاتے۔

(آنگی)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

"● ۔پارٹی بڑی شاندار تھی۔ راجہ صاحب لاگرا اور نواب ف کھاگھرا، بیگم دادری اور رانی صاحبہ گاودی، کرنل گھوڑے والا اور مسز چھتری والا، پیر صاحب بوڑھا اور مہنت صاحب توڑھا۔" (لکڑی کے کھوکھے)

● "میں آرٹسٹ نما لونڈے کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس نے مجھے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ پھر میں نے اُسے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا تو جواب میں اس نے پھر مجھے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ اس کے بعد میں نے پھر اُسے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرنا چاہا کہ لاری ایک گڈھے سے گزری اور گویا بھونچال سے گزر گئی۔" ——— (اجنتا سے آگے)

کرشن چندر نے اپنا بچپن کشمیر کی وادیوں میں بسر کیا۔ اس لئے اُن کی اکثر یادیں کشمیر سے وابستہ ہیں۔ ابتداً میں انھوں نے کشمیر کے حسن کی کہانیاں لکھیں لیکن انہیں جلد ہی احساس ہوا کہ یہ صرف تصویر کا ایک رخ ہے۔ اس جنت کے دوسری طرف ایک جہنم بھی بسا ہوا ہے جس کی طرف بہت کم آنکھیں اٹھتی ہیں۔ اس کی وجہ کرشن چندر کا فلسفۂ حیات ہے۔ کرشن چندر بنیادی طور پر ترقی پسند ہیں۔ اُن کا دل انسان دوستی، امن پسندی اور انسان پرستی کے جذبات سے لبریز ہے۔ اُن کے یہاں جس طرح کا تنوع اور جدت ملتی ہے۔ اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔

کرشن چندر کے افسانوں کے ساتھ ساتھ اُن کے ناول بھی منظر عام پر آنے لگے۔ اُن کا پہلا ناول شکست کے نام سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا جو انھوں نے صرف اکیس (۲۱) دن میں کشمیر کے گلمرگ ہوٹل میں لکھا۔ انتشار، بے چینی اور درد و کرب سے بھرپور یہ ایک ایسا ناول ہے جس کو کرشن چندر نے کشمیر کے فطری حسن کے رومان انگیز پس منظر میں پیش کیا ہے۔ میری یادوں کے چنار کرشن چندر کا ایک سوانحی ناول ہے۔ یہ پونچھ کے پس منظر میں لکھا گیا ناول ہے۔ طوفان کی کلیاں، جب کھیت جاگے، سڑک واپس جاتی ہے، دوسری برف باری کے بعد وغیرہ جیسے کرشن چندر کے ناولوں میں کشمیر کا حسن پورے آب و تاب کے ساتھ اُمنڈ آیا ہے۔ اس خوبصورتی کے ساتھ ساتھ ان ناولوں میں کشمیر میں رہنے والوں کی مجبوری اور بے چارگی بھی جابجا نظر آتی ہے۔ کرشن چندر کے ناولوں میں کشمیر کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ یہاں کے محنت کش عوام کی بھرپور رہنمائندگی ملتی ہے۔ وہ کشمیر کے حسن اور اس کی خوبصورتی سے بے حد متاثر تھے۔ انھیں یہاں کے بے بس عوام سے اس لئے دلچسپی تھی کہ یہ یہاں

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh. Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہی محنت کش ہیں لیکن اتنی محنت کرنے کے باوجود بھی افلاس و ناداری کی زندگی گزارتے ہیں۔ وہ ان کے خوشحالی کے خواہاں تھے اور چاہتے تھے کہ دنیا کی تمام قوموں کے ساتھ ساتھ یہ قوم بھی ترقی کی طرف گامزن ہو۔ ان کے مطابق دنیا بھر کے لوگ ان کی محنت کی داد دیتے ہیں لیکن ان کی مجبوری، بے کسی اور افلاس کے بارے میں کوئی بھی توجہ نہیں دیتا ہے۔ ان تمام باتوں کی وضاحت کرتے ہوئے کرشن چندر خود رقمطراز ہیں:-

"میری زندگی کے علاوہ میرے ادب میں جو احساسِ جمال کسی کو ملتا ہے۔ اس کا منبع یہی فطرت ہے۔ واقفیت اور حقیقت نگاری کا پہلا درس بھی مجھے ایک طرح سے فطرت ہی نے دیا۔ کشمیر کی خوبصورت وادیوں اور مرغزاروں میں رہنے والوں کی تہی دستی، مجبوری، بے چارگی اور غربت کا تضاد اس قدر واضح اور شدید تھا کہ میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ایسا کیوں ہے۔ اس کے اسباب و علل پر غور کرنے کا جو سلسلہ چلا تو پھر بہت دور تک پہنچا۔" [1]

کرشن چندر ایک اشتراکی ادیب تھے لہٰذا انہیں دولت کی نامساوی تقسیم اور طبقاتی جدوجہد کا احساس تھا۔ وہ سرمایہ اور محنت کی صدیوں پرانی لڑائی سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے۔ ان کو تواریخ کا صحیح شعور بھی حاصل تھا۔ لہٰذا ان کا فن ان تمام حقائق کا احاطہ کرتا ہے۔ وہ مناظر قدرت کے مقامی رنگ و بو سے اپنی کہانیوں کا پس منظر تعمیر کرتے ہیں۔

کرشن چندر کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا دلفریب طرزِ تحریر ہے۔ وہ صحیح معنوں میں نثر میں شاعری کرتے ہیں۔ ان کا کلام سحر طراز ہے۔ ان کی تخلیقات کا جائزہ لینے کے بعد اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے اپنے عہد کو سب سے زیادہ متاثر کیا تو بے جا نہیں ہوگا۔ کرشن چندر محنت پسند طبقے کے دوست ہیں۔ وہ اپنے قلم سے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہمیشہ لڑتے رہے۔ ان کا ادب ان کے عہد کی کھلی تاریخ ہے۔ یہ تواریخ وہ اپنی کہانیوں، بے شمار ناولوں، رپورتاژوں، ڈراموں، فیچروں اور مضامین میں پیش کر چکے ہیں۔ یہ سارا ادب ترقی پسند ہے اور عوام کی زندگی کے ساتھ گہری مطابقت رکھتا ہے۔

کرشن چندر کے معاصرین میں سے منٹو اور راجندر سنگھ بیدی قابل ذکر ہیں۔ یہ

---

[1] شخصیات اور واقعات جنہوں نے مجھے متاثر کیا، مرتبہ جنید احمد ص ۱۴۰، ۱۴۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

لوگ تقریباً ساتھ ساتھ ابھرے اور بقول ڈاکٹر برج پریمی اردو افسانے کی تکون کہلائی۔ بیدی نے اگرچہ ان دو کے مقابلے میں بہت کم لکھا لیکن سوچ سمجھ کر لکھا اور اپنی فنی عظمت برقرار رکھی۔ کرشن چندر نے اپنی شاعرانہ نثر سے پڑھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی اور منٹو کہانی کہنے کا گر جانتے تھے۔ جلد ہی ہر دل عزیز کہانی کار بن گئے۔ کرشن چندر بے تکان لکھتے رہے اور جلد ہی اپنا سکہ جمانے میں کامیاب ہوئے۔ ان کے موضوعات میں تنوع ہے اور وہ اپنے خیالات کو نرالے انداز میں پیش کرتے رہے۔ انھوں نے اپنی خوبصورت کہانیوں سے نہ صرف عوام کا دل جیت لیا بلکہ مختلف نظریات رکھنے والے ادیب بھی متاثر ہوئے۔ حتیٰ کہ منٹو جیسا خوددار فن کار بھی کرشن چندر کی کہانیوں پر عش عش کرنے لگا۔ ڈاکٹر برج پریمی اپنی کتاب 'منٹو کتھا' میں لکھتے ہیں:-

> "سعادت حسن منٹو کو طبع زاد افسانوں کی حدود میں داخل ہونے کے لئے مقابلتاً زیادہ سفر طے کرنا پڑا لیکن کرشن چندر آتے ہی اپنا سکہ جمانے میں کامیاب ہوئے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ابتدا میں موضوعات کے تنوع سے زیادہ ان کی رومانیت اور دل کی تہوں میں اترنے والی ان کی شاعرانہ نثر تھی۔ حتیٰ کہ منٹو جیسا ازلی خودسر اور خوددار فن کار بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور ان کا استقبال کیا۔"[1]

کرشن چندر کی کہانیوں اور ناولوں میں طنز و مزاح کی بھرپور جھلکیاں ملتی ہے وہ اپنے دور کے تمام معاصرین طنز نگاروں میں قابلِ قدر مقام رکھتے ہیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز طنز نگاری سے کیا اور اپنے فارسی کے استاد پر مزاحیہ خاکہ لکھا۔ 'ہوائی قلعے' کرشن چندر کے مزاحیہ مضامین کا اولین مجموعہ ہے جو اردو طنز و ظرافت کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی بیسیوں تحریروں میں ظرافت کی چاشنی ملتی ہے جن میں 'پرائے خدا'، 'تین غنڈے'، 'ان داتا'، 'نئے غلام'، 'کتاب کا کفن'، 'زندگی کے موڑ پر'، 'لالہ گھسیٹ رام'، 'ناگ منی'، 'فلمی قاعدہ'، 'جانور اور شیر'، 'سمندر دور ہے'، 'ایک گرجا ایک خندق'، 'بڑے آدمی'، 'بادشاہ'، 'مہالکشمی کا پل'، 'باتیں' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ کرشن چندر کے انشائیے بھی پڑھنے کے لائق ہیں۔ اگرچہ انھوں نے

۱۔ منٹو کتھا، از ڈاکٹر برج پریمی، صفحہ [illegible]

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اس صنف کی طرف خاص توجہ نہیں کی لیکن پھر بھی اُن کے کئی انشائیے قابلِ مطالعہ ہیں۔ غسلیات، ٹوٹ والا، جان پہچان، رونا، ہوائی قلعے کرشن چندر کے کامیاب انشائیے ہیں۔ کرشن چندر کے ڈرامے اور فیچر بھی اُن کے انشائیوں کی طرح دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں۔ سرائے کے باہر، قاہرہ کی ایک شام، حجامت، شکست کے بعد، دروازہ اور مس بیلا باٹلی والا اُن کے اچھے ڈرامے ہیں جو اردو ڈراما نگاری کی تاریخ میں جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔

کرشن چندر کا فن ذہنی عیاشی کا فن نہیں۔ وہ اپنی کہانیوں اور ناولوں سے محض لوگوں کا دل نہیں بہلاتے بلکہ اپنے عہد کی تمام نحوستوں کو آشکار کرتے ہیں۔ اُن کے یہاں ہر طرح کے انسان ملتے ہیں۔ ایسے بھی جو منفی رجحان رکھتے اور وہ بھی جن کے سہارے سماج آگے بڑھتا اور سنورتا ہے۔ ان کے کرداروں میں مل مزدور بھی ہیں اور کسان بھی، فٹ پاتھ پر سونے والے بھی اور ایرانی پلاؤ کھانے والے بھی، فلم کے لوگ بھی اور ملازم پیشہ بھی۔ کردار نگاری میں انہیں خاص ملکہ حاصل ہے۔ اُن کی کہانیوں میں حقیقی اور جیتے جاگتے کردار نظر آتے ہیں۔ کرشن چندر کو زبان پر کافی دسترس حاصل ہے۔ وہ ہندی پر بھی گرفت رکھتے ہیں۔ اسی لئے اُن کی تخلیقات میں ہندی اور اردو کی آمیزش ملتی ہے اور اس پر اُن کا شاعرانہ نثر سونے پر سہاگے کا کام دیتا ہے۔ وہ خوبصورت تشبیہات اور استعارات بھی استعمال کرتے ہیں اور محاورات اور تراکیب بھی۔ منظر نگاری میں کرشن چندر کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ الفاظ کی جادوگری سے بڑے دلنواز منظر کاغذ پر اُتارتے ہیں کہ حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ کرشن چندر کا سدا بہار قلم ہمیشہ گل کاریاں بکھیرتا رہا ہے۔ مغربی ادب کے گہرے مطالعے نے ان کی فکر و نظر کو وسعت بخشی ہے۔ چنانچہ انھوں نے نئے نئے تجربے بھی کئے ہیں اور اردو افسانے کو اتنی بلندی پر پہنچا دیا ہے جہاں وہ دنیا کے کسی افسانے کے ساتھ آنکھ ملا سکتا ہے۔ کرشن چندر کی تخلیقات کا ترجمہ دنیا کی تقریباً ہر زبان میں ہو چکا ہے۔

(جدید فکر و فن) شمیم
جلد ۸ - شمارہ ۲۹ - اپریل، جون ۱۹۹۶ء

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

محمد یوسف ٹینگ ــ ایک مطالعہ

ریاست کے جن قلم کاروں، عالموں اور دانشوروں نے اُردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کی اور تحقیق و تنقید کو اپنا موضوع خاص بنایا، اُن میں عبدالاحد آزاد، نند لال طالب، نرسنگھ داس نرگس، دیا کشن گردش، بلدیو پرشاد شرما، عشرت کاشمیری، اکبر حیدری، رحمٰن راہی، قیصر قلندر، حامدی کاشمیری، شمیم احمد شمیم، برج پریمی، موتی لال ساقی، مرغوب بانہالی وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ محمد یوسف ٹینگ کا نام عالموں اور دانشوروں کی اسی فہرست میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔

محمد یوسف ٹینگ ۱۹۳۵ء میں سرینگر سے تقریباً ۴۰ کلومیٹر دور شوپیاں کشمیر میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد خواجہ عبدالرزاق ٹینگ ایک باوقار اور خدا ترس بزرگ تھے۔ ٹینگ صاحب نے ابتدائی تعلیم مقامی اسکولوں سے حاصل کی۔ بی۔ اے (آنرز) پاس کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کی۔ چونکہ بچپن سے ہی اُن کو ادب اور صحافت سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس لئے آپ سب سے پہلے ہفتہ وار اخبار 'جہانِ نو' سرینگر سے وابستہ ہو گئے۔ آپ کچھ عرصہ تک ریڈیو کشمیر سرینگر میں بحیثیت نیوز ریڈر بھی کام کرتے رہے۔ اس کے بعد ریاستی محکمہ اطلاعات کی طرف سے شائع ہونے والے جریدے ماہنامہ 'تعمیر' کے نائب مدیر مقرر ہوئے بعد میں آپ اس کے مدیر ہو گئے۔ ۱۹۶۲ء میں آپ نے ریاستی کلچرل اکادمی کی طرف سے شائع ہونے والے رسالے 'شیرازہ' کی ادارت سنبھالی۔ یہ رسالہ بہت ہی قلیل عرصے میں آپ کی محنت اور خداداد صلاحیت سے ادبی دُنیا میں اپنا وقار بنانے میں کامیاب ہوا۔ ٹینگ صاحب مختلف اخبارات کے کالم نویس بھی رہے ہیں۔ ریاستی کلچرل اکادمی کے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation Chandigarh. Funding by IKS-MoE 2025-Grant

ے باز کھ (محمد یوسف ٹینگ نمبر) اکتوبر ۱۹۹۶ء تا مارچ ۱۹۹۷ء، جلد ۹، ص ۱

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سکریٹری کے فرائض نبھاتے ہوئے آپ ڈائریکٹر جنرل کلچر بھی رہے ہے۔ آپ کچھ عرصہ کے لئے ناظم اطلاعات بھی رہے۔ ابھی چند برس پہلے ریاستی کلچرل اکادمی کے سکریٹری کے عہدے سے آپ ریٹائر ہوئے اور اب لکھنے پڑھنے کے کام میں منہمک ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ریاستی پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہیں۔ ٹینگ صاحب ساہتیہ اکادمی کے کشمیری ایڈوائزری بورڈ کے کنوینیر ہیں۔ اس کے علاوہ آپ سکریٹری شیر کشمیر میموریل کمیٹی سکریٹری شیخ العالم ششش صد سالہ کمیٹی، اور سکریٹری سال للہ دید کمیٹی بھی ہیں۔

محمد یوسف ٹینگ صرف ایک فرد کا نام نہیں بلکہ وہ ایک انسٹی ٹیوشن ہیں۔ وہ ادیب بھی ہیں اور صحافی بھی، دانشور بھی اور محقق بھی، انجمن ساز بھی اور ایڈمنسٹریٹر بھی ان کی شخصیت تہہ دار اور اُن کی ادبی حیثیت مُسلم ہے۔ ٹینگ صاحب کے متنوع ادبی کارناموں پر اس مختصر سے مقالے میں اظہار خیال کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ انھوں نے زبان وادب، تاریخ وتمدن، اور تہذیب وکلچر کے گوناگوں پہلوؤں پر قلم اٹھایا ہے۔ اور اپنے خیالات کا اظہار بڑے مؤثر ڈھنگ سے کیا ہے۔ اُن کا مطالعہ گہرا اور مشاہدہ غضب کا ہے۔ ٹینگ صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ وہ مہتاب تخلص کرتے تھے۔ بعد میں ایک مدت تک معصوم کے نام سے بھی لکھتے رہے۔[۵] ٹینگ صاحب اُردو اور کشمیری دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ اور اُن سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔ انگریزی زبان سے بھی انہیں گہرا لگاؤ ہے۔ چنانچہ کشمیر۔ ڈریم اینڈ دیہ ڈائیلما کے نام سے اُن کی کتاب عنقریب ہی شایع ہو رہی ہے۔ اس کے علاوہ ٹینگ صاحب اُردو اور کشمیری نظم ونثر بس تقریباً دو درجن کتابیں ایڈیٹ کر چکے ہیں جن میں ریاستی کلچرل اکادمی کی طرف سے شایع ہونے والے رسالہ شیرازہ، کے خاص نمبر اور رسالنامہ ہمارا ادب کے تقریباً گیارہ شماروں کے علاوہ داغ تہ دگ، گلریز، کلیات مہجور، کلیات ولی اللہ متو، وطن چھے نادلایان (کشمیری) رسول میر کی نمائندہ نظموں کا اُردو ترجمہ، وطنی وقومی نظموں کا مجموعہ وطن کی پکار، عبدالاحد آزاد کی کتاب کشمیری زبان اور شاعری کی دوسری اور تیسری جلد عبدالقادر سروری (مرحوم) کی کتاب کشمیر میں اُردو، لوک ادب نمبر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ٹینگ صاحب ایک بالغ نظر نقاد ہیں۔ وہ ادب کے مارکسی نظریئے سے متاثر ہیں

۵۔ رسالہ باوتھ (کشمیری) ٹینگ نمبر اکتوبر ۱۹۹۶ء تا مارچ ۱۹۹۷ء ص ۶

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

میر، غالب، اقبال، فیض، ناصر کاظمی، منٹو اور کشمیری ادبیات میں رسول میر، مہجور، للہ دید، شیخ العالم، عبدالاحد آزاد، رسا وغیرہ اُن کے اہم موضوعات ہیں۔ وہ کشمیری تاریخ، ثقافت، تہذیب و تمدن اور کلچر پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں اور اس کے مستور پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر برج پریمی اپنی کتاب میں ٹینگ صاحب کے عالمانہ تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"محمد یوسف ٹینگ کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ ہمارے بالغ نظر نقاد ہیں۔ وہ اردو اور کشمیری ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ غالب، اقبال، منٹو اُن کے محبوب موضوع ہیں۔ کشمیری اور اردو کے شعر و ادب سے متعلق اُن کے بعض عالمانہ تحقیقی اور تنقیدی مقالے چھپ چکے ہیں ..... اُن کے شگفتہ اسلوب اور منطقی استدلال سے ایک نئی سوچ و فکر کا احساس ہوتا ہے۔" [۱]

ٹینگ صاحب کا پہلا تحقیقی و تنقیدی مقالات کا مجموعہ "شناخت" کے نام سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ اُس میں اُن کے اکیس ۱۹ مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین گذشتہ تیس ۱۶ پنتیس ۳۵ برس میں لکھے گئے مختلف ادبی و ثقافتی موضوعات پر دال ہیں اور عالمانہ بصیرت رکھتے ہیں۔ قرأئیات کی نادر دریافت، ایک ادبی سرقے کا سنسنی خیز انکشاف، علامہ اقبال اور محمد دین فوق، ہیئت ال۔ اسطور، تاریخ اور ادب، مدیر کے مسائل، ہمالیہ کی گود میں، رات رقص اور رسول میر، گلریز۔ ترجمہ جو تخلیق بن گیا وغیرہ اُن کے چند موضوعات ہیں، جو دلچسپ بھی ہیں اور معنی خیز بھی۔ اِن مضامین کا مطالعہ کرنے سے ٹینگ صاحب کی فنی بصیرت، ژرف نگاہی اور دیدہ وری کا پتہ چلتا ہے۔

ٹینگ صاحب اپنے مادرِ وطن کشمیر سے بے پناہ عشق کرتے ہیں۔ انہیں کشمیر کی تاریخ، تہذیب اور کلچر سے گہرا لگاؤ ہے۔ وہ یہاں کے صحت مند اقدار عزیز رکھتے ہیں۔ اسی لئے اُن کی اکثر تحریروں میں کشمیر کی مٹی کی بُو باس محسوس کی جاسکتی ہے۔ کشمیر کے شعر و ادب کا منظر نامہ ہو یا کسی نادر نسخے کی دریافت، ٹینگ صاحب کی دُور بین آنکھوں سے کبھی اوجھل نہیں رہتا بلکہ وہ تلاش و جستجو سے نہ جانے کتنی تہیں کھول دیتے ہیں اور پھر نتیجہ اخذ کرتے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

[۱] جلوہ صد رنگ۔ ڈاکٹر برج پریمی۔ ص ۲۱۶

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہیں اور یہی چیز اُن کو اپنے معاصرین میں ایک الگ اور منفرد مقام دلاتی ہے۔ چنانچہ "شناخت" میں اُن کا یہی جذبہ کارفرما ہے۔ خود تحریر فرماتے ہیں:-

"اس کتاب میں کشمیر اور کشمیریت ساری مضامین میں ایک اندرونی ربط قائم کرتی ہے۔ اکثر مضامین جو براہ راست کشمیر یا کشمیری ادب سے تعلق نہیں رکھتے۔ وہ ایسے ادیبوں کا ذکر کرتے ہیں جن کے خمیر میں کشمیر رچا بسا ہوا تھا۔" لے

ٹینگ صاحب کا دوسرا تنقیدی مضامین کا مجموعہ "تلاش" کے نام سے شایع ہو چکا ہے یہ کشمیری زبان و ادب کے بعض اہم گوشوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس میں عملی تنقید کے بہت ہی اچھے نمونے ملتے ہیں۔ شیخ العالمؒ ہو یا للہ دید، پرمانند ہو یا رسول میر، نادم ہو یا کامل، ٹینگ صاحب کا قلم بے تکان چلتا ہے۔ وہ اپنے خیالات سے نئے نئے رنگ بھر دیتے ہیں۔ اور اپنی تحریروں میں نئی رُوح پھونک دیتے ہیں۔

ٹینگ صاحب کی ایک اور کتاب "مہجور شناسی" بھی شایع ہو چکی ہے۔ یہ کشمیری زبان و ادب میں منفرد کوشش ہے اور اضافے کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب شاعر کشمیر مہجور کی شخصیت اور اُن کی شاعری کو سمجھنے اور پرکھنے میں بہت مدد دیتی ہے اور اُن کے بعض اہم گوشے سامنے لاتی ہے۔ اس کتاب پر ریاستی کلچرل اکادمی نے ٹینگ صاحب کو ایوارڈ سے نوازا۔

ٹینگ صاحب کے اور بھی متعدد ادبی کارنامے ہیں جن کا ذکر کرنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے آپ نے کشمیری زبان کے چند نامور شعراء کے کلام کو تلاش بسیار کے بعد مرتب کرکے شایع کیا ہے اور اُن کی شخصیت اور شاعری پر مدلل بحث کی ہے۔ ان میں مقبول شاہ کرالہ واری، مہجور اور رسول میر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ کلیات رسول میر کو آپ نے منفرد انداز میں ایڈٹ کیا ہے۔ وہ نہ صرف قابل داد ہے بلکہ اس طرح سے آپ نے کشمیری زبان کے صف اول کے شعراء کے مکمل کلام کو تلف ہونے سے بچایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اُن کی آواز عام لوگوں تک پہنچائی ہے۔

آپ کی نگرانی میں ریاستی کلچرل اکادمی نے چند بہت ہی اہم پروجیکٹوں پر کام کیا اور

لے "شناخت" - محمد یوسف ٹینگ - ص ۲۲۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ان کو عملی جامہ پہنایا جن میں کاشر ڈکشنری (دو جلدوں میں) اردو کشمیری فرہنگ (۱۲ جلدوں میں) اور کاشر انسیکلوپیڈیا (دو جلدوں میں) شامل ہیں۔ آپ کی سرپرستی میں ریاستی کلچرل اکادمی کے زیر اہتمام اکادمی کے نام سے ایک خوبصورت خبر نامہ برس ہا برس تک شائع ہوتا رہا۔ اس خبر نامے نے ملک گیر مقبولیت حاصل کی تھی۔ پرانے مسودات کے وضاحتی کیٹلاگ کی ترتیب، مختلف شعرائے قبروں پر کتبے نصب کروانا اور قدیم کشمیری زیورات کو جمع کر کے محفوظ کرنا بھی ٹینگ صاحب کے دیگر علمی، ادبی اور تحقیقی کارناموں میں شامل ہے۔ آپ کی سربراہی میں لبوک میں یوسف شاہ چک کی قبر پر کتبہ نصب کیا گیا اور اس طرح سے آپ نے کشمیر کے حقیقی فرزند ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

ٹینگ صاحب کے متعدد علمی، ادبی کارنامے ہیں جن کو کسی بھی صورت میں صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے نہ صرف اردو، کشمیری، ڈوگری، ہندی اور پنجابی زبانوں میں شیرازہ باقاعدگی کے ساتھ جاری کرنے کا کام عمل میں لایا بلکہ ان زبانوں کے علاوہ انھوں نے اپنی نگرانی میں انگریزی، پہاڑی، گوجری اور لداخی کلچر، تہذیب و تمدن اور ادب کو فروغ دینے کے لئے بہت سارے اقدامات کئے۔ اس طرح سے ان زبانوں کو ترقی و فروغ دینے میں انھوں نے اپنا بھرپور تعاون پیش کیا۔

ٹینگ صاحب نے وقتاً فوقتاً پہاڑی اور گوجری زبانوں میں اعلیٰ پیمانے پر مشاعروں، سمیناروں اور مباحثوں کا انعقاد بھی کروایا۔ یہ انہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ ان دونوں زبانوں میں تاریخ، کلچر، تہذیب، ثقافت کے ساتھ ساتھ ادب کے گوناگوں موضوعات پر معیاری ادب شائع ہونے لگا۔ ان کی سرپرستی میں گوجری زبان میں ڈکشنری شائع ہوئی۔ اس طرح سے انھوں نے علاقائی زبانوں کی بھی بے لوث خدمت کی۔

ٹینگ صاحب کی دیباچہ نگاری بھی ان کی غیر معمولی صلاحیت کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے کشمیری زبان کے معروف شاعر اور محقق عبدالاحد آزاد (مرحوم) سے لے کر دورِ جدید کے منفرد اسلوب کے شاعر محمد یسین بیگ کے شعری مجموعے دہر آشوب تک بیسیوں قلم کاروں کے شعری اور نثری مجموعوں پر نہایت ہی فکر انگیز دیباچے اور مقدمات رقم کئے ہیں۔ بعض تصانیف پر انھوں نے تقریظ اور آرا بھی پیش کی ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان دیباچوں میں بھی وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اور یہی اُن کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اُن کے دیباچے اور مقدمات ایک وقیع سرمایہ ہیں۔ جو تنقید و تحقیق میں ایک بیش بہا خزانہ ہے اور علمی و ادبی لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ٹینگ صاحب کے حواشی بھی غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ اُن کی سرپرستی میں ریاستی کلچرل اکادمی نے شعر و ادب، تاریخ، تحقیق اور آرٹ کے حوالے سے جو منازل طے کئے ہیں۔ وہ اُن کی محنت، ذہانت اور خداداد صلاحیت کا نتیجہ ہے۔ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے بہت سی ایسی چیزوں کو تلاش کیا جن پر زمانے کی ناقدری کی دھول جمی ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں کشمیری زبان کے نامور شاعر اور محقق عبدالاحد آزاد (مرحوم) کی کتاب کشمیری زبان اور شاعری قابلِ ذکر ہے۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے اور آج بھی جبکہ کشمیری شاعری نے ایک اور بڑا دور شروع کیا ہے، یہ تصنیف مستند تصور کی جاتی ہے لیکن آزاد کے انتقال کے وقت یہ تصنیف منتشر حالت میں تھی۔ اُن کی بے وقت موت نے انھیں اپنی اس گراں قدر تصنیف پر نظرِ ثانی کا موقعہ بھی نہیں دیا تھا۔ ٹینگ صاحب نے آزاد کے اس کارنامے کو از سرِ نو تشکیل دیا اور اس پر جگہ جگہ حواشی سے گرہیں کھول دی ہیں اور یہ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم) کی تصنیف کشمیر میں اردو کو بھی ریاستی کلچرل اکادمی نے ٹینگ صاحب کے بصیرت افروز مقدمہ اور حواشی کے ساتھ تین حصوں میں شائع کیا ہے۔ اس قابلِ قدر کتاب کی اشاعت کا پروگرام بھی سروری مرحوم کے انتقال کے بعد کئی سال تک التوا میں پڑا تھا لیکن ٹینگ صاحب کی ذاتی کوششوں سے آج ہمارے سامنے جموں و کشمیر کے شعر و ادب کی مکمل تاریخ ہے۔

ٹینگ صاحب سائنٹفک نقطۂ نظر یہ تنقید کے حامی ہیں۔ اگرچہ وہ قدیم اور فرسودہ میزانِ نقد پر یقین نہیں رکھتے ہیں اور نہ اُن کو بروئے کار لاتے ہیں لیکن کسی ادب پارے کو جانچنے پرکھنے اور برتنے کے لئے اُس عہد کا احاطہ ضرور کرتے ہیں جس میں اس کی تخلیق ہوئی ہو۔ انھوں نے نظری اور عملی دونوں طرح کی تنقیدیں لکھی ہیں۔ ٹینگ صاحب کے ہاں آج کل کے بہت سارے نقادوں کی طرح اشعار اور اقتباسات کی بھرمار نہیں ملتی ہے لیکن وہ اپنی تنقیدوں میں کتابوں اور ادبی شخصیتوں کے نام اور ادبی تحریکوں کے متعلق واضح حوالے ضرور رکھتے ہیں، اور اس طرح اپنی تنقیدوں کو وزن دار بناتے ہیں۔ وہ ایسی نثر کو پسند کرتے ہیں جس میں نہ صرف علمیت کا مظاہرہ کیا گیا ہو بلکہ خیال ستھرا اور نکھرا ہوا ہو۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ٹینگ صاحب کی انہی خصوصیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شمیم احمد شمیم (مرحوم) نے آج سے لگ بھگ ستائیس ۲۷ سال قبل اپنے مخصوص انداز میں لکھا:-

"میں پوری ذمہ داری اور دیانت داری کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ اُردو زبان و بیان پر جو قدرت ٹینگ صاحب کو حاصل ہے، وہ کم از کم اس ریاست کے کسی دوسرے ادیب اور صحافی کو حاصل نہیں"۔[۱]

ٹینگ صاحب کی تحریروں میں اندرونی وحدت ہے۔ قیاس آرائیوں پر عمل کرنا اُن کے مزاج میں نہیں بلکہ وہ پہلے تحقیق کرتے ہیں اور پھر بات کو وضاحت سے بیان کرنے کے قائل ہیں۔ اُن کا اندازِ تحریر منفرد ہے اور اُن کے خیالات فکر انگیز ہیں۔ وہ تنقیدی میزانوں کو اپنانے کے وقت تعصب سے کام نہیں لیتے اور نہ ہی فیصلہ دینے کے وقت دور کی کوڑی لانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اپنے انوکھے انداز میں بات کہنے کا گر رکھتے ہیں۔ زبان و بیان کے معاملے میں بھی وہ بڑے محتاط ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم) لکھتے ہیں:-

"یوسف ٹینگ اپنے سوچنے کے انداز میں اور لکھنے کے اسلوب میں ہر جگہ اپنی انفرادیت قائم رکھنے اور بعض اوقات اس کو نمایاں کرنے کی طرف بھی مائل ہیں اور اس میلان کی بدولت کبھی کبھی ان کے قلم سے کچھ اچھی ترکیبیں اچھے اظہار اور لفظ ادا ہو گئے ہیں"۔

ٹینگ صاحب شاعر نہیں لیکن اُن کی نثر بڑی دلکش ہوتی ہے۔ تنقید کی زبان عام طور سے پیچیدہ کھردری اور سپاٹ ہوتی ہے لیکن اس طرح کا الزام ٹینگ صاحب کو نہیں دیا جاسکتا۔ اُن کا طرزِ استدلال بڑا دلنشین ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والا اُن کی تحریریں پڑھ کر قائل ہوتا ہے۔ ٹینگ صاحب زبان و بیان دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ وہ دورِ حاضر کے ایک اہم قلمکار ہیں۔ انھوں نے تحقیق و تنقید کے سلسلے میں جو خدمات انجام دیئے ہیں۔ اُسے کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

رنبا جاودانی میموریل لیٹریری سوسائٹی جموں، جموں و کشمیر اردو فورم جموں اور شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی جموں کی طرف سے منعقد کی گئی تقریب جشنِ ٹینگ میں ۱۲ مارچ ۱۹۹۶ء کو شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی میں پڑھا گیا۔

---

[۱] ہفت روزہ آئینہ، سرینگر، جون ۱۹۷۵ء ص ۸۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اختر محی الدین

میرے مطالعے کی روشنی میں

اختر محی الدین کشمیری زبان کے معروف افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے اُس زمانے میں لکھنا شروع کیا جب کشمیری افسانہ ابھی گھٹنوں کے بل چل رہا تھا اور اس میں وہ نزاکت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اُن سے پہلے دینا ناتھ نادم، سوم ناتھ زتشی، عزیز ہارون اور نور محمد روشن وغیرہ نے چند افسانے لکھے تھے لیکن بقول اختر یہ افسانہ نگار ایک خاص فلسفے کے تحت افسانہ لکھتے تھے جس کو ترقی پسند فلسفہ کہتے ہیں اور یہ لوگ ایسے کرداروں کو پیش کرتے تھے جن کی جھلک تک ہمارے سماج میں دُور دُور تک نظر نہیں آتی ہے۔ اختر نے پہلی بار محسوس کیا کہ اُن کرداروں کو افسانوں میں جگہ دینا بے مقصد ہے جن کا ہمارے سماج سے دُور کا واسطہ بھی نہیں ہے اور ایسی کہانیاں لکھنا فضول ہیں جن کی جھلک تک ہم اپنے سماج میں کہیں نہیں دیکھتے ہیں۔ انھوں نے اس چیلنج کا مقابلہ بڑے اعتماد سے کیا۔ حالانکہ بقول خود اُن کے سامنے ایک بے چہرہ ہجوم FACELESS MOB تھا۔ اور افسانوی زبان بھی اتنی منجھی ہوئی نہیں تھی۔ اختر نے اپنی خداداد صلاحیت سے کشمیری افسانے میں نئے نئے رنگ بھر دیئے اور اس کو ایک نئے موڑ پہ لا کھڑا کر دیا۔

اختر محی الدین ۱۷ اپریل ۱۹۲۸ء کو سری نگر کے بتہ مالو علاقے میں پیدا ہوئے۔ اپنے نام اور تخلص کے بارے میں خود اُن کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں۔ ایک ملاقات کے دوران انھوں نے میرے ایک استفسار کے جواب میں بتایا۔

"میرا اصلی نام غلام محی الدین ہے لیکن لفظ غلام کے ساتھ مجھے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے میں ابتدا میں صرف محی الدین لکھا کرتا تھا۔ بعد میں جب میں نے دسویں جماعت پاس کی۔ ادبی محفل میں افسانہ پڑھا تو بنسی نردوش صاحب نے میرا نام اختر رکھا تو اُس دن سے اب تک اختر محی الدین کے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

نام سے جانا جاتا ہوں۔ یہ سنہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے۔" [۵]

اختر نے اپنا بچپن اور جوانی کے ایام سری نگر کے بتہ مالو علاقے کے گلی کوچوں میں گزارے۔ یہ علاقہ ایک باکمال درویش، صوفی منش اور بزرگ بتہ مول کے نام سے ساری ریاست میں مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پرانے زمانے میں کشمیر قحط سالی کا شکار ہوا تھا۔ تو اس بزرگ نے علاقے میں ایک لنگر چالو کیا تھا۔ اس طرح سے وہ کافی عرصے تک بھوکوں کو کھانا کھلاتے رہے اور مصیبت زدوں کو سہارا دیتے رہے۔ یہ صوفی منش اور درویش صفت بزرگ اسی علاقے میں مدفون ہیں۔ انہی کی نسبت اس علاقے کا نام بتہ مالو ہے۔

اختر کے والد بزرگوار ایک تاجر تھے اور امیرا کدل (سرینگر) میں دکان کرتے تھے لہٰذا گھر میں علم و ادب کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ اختر نے ابتدائی درسیات اپنے محلے کے سکول سے حاصل کی۔ اسلامیہ مڈل اسکول نائیمہ سے آٹھویں جماعت پاس کی۔ ادھر انھوں نے اسکول کی طرف سے کھیلے جانے والے ڈرامے میں اداکاری کے جوہر بھی دکھائے اور اس طرح سے ان میں ڈرامہ نگاری کا شوق پیدا ہوا۔ میٹریکولیشن نیشنل ہائی سکول کرن نگر (سری نگر) سے کامیاب کرکے اختر نے ایس پی کالج میں داخلہ لیا۔ کالج کے ماحول اور قابل اساتذہ نے اُن کے اس شوق کو ہوا دی۔ کچھ عرصہ امرسنگھ کالج سرینگر میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے علی گڑھ جانا چاہتے تھے لیکن گھریلو مشکلات سدِ راہ تھیں۔ اس لئے یہ پروگرام ترک کرنا پڑا۔

اختر نے اپنی محنت اور صلاحیت سے کہانی کاروں کے صف میں ایک نمایاں مقام بنایا۔ کالج کے دنوں میں وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اکثر سری پرتاپ لائبریری سری نگر جایا کرتے تھے اور وہاں کتابیں نکال کر پڑھتے تھے۔ اردو میں بقول اُن کے انھوں نے سعادت حسن منٹو کے افسانے پڑھے تھے۔ اُن کی کہانیوں نے ہی اختر میں اندر کا کہانی کار بیدار کیا اور وہ خوبصورت کہانیاں لکھنے لگے۔ منٹو کے علاوہ کافی تعداد میں سیکالوجی کی کتابیں بھی اُن کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ انگریزی ادبیات سے بھی وہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ انگریزی مصنفین کی کتابیں بڑے شوق سے پڑھا کرتے ہیں۔ خاص طور پر بچپن میں وہ انگریزی زبان کے معروف تخلیق کار پرل بک کے ادب پاروں سے محظوظ ہوا کرتے تھے۔ ان ادب پاروں کے مطالعے سے اُن کا

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

۵۔ اختر محی الدین سے ایک ملاقات

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ذہن کشادہ ہوگیا اور وہ خود بھی کہانیاں تخلیق کرنے کی طرف راغب ہوگئے۔

اختر محی الدین نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ انھوں نے یونانی حکیم کے نام سے اپنا سب سے پہلا اردو افسانہ ۱۹۵۱ء میں لکھا۔ یہ ایک قسم کا طنزیہ افسانہ تھا جو اُس زمانے میں بے حد پسند کیا گیا اور بعد میں یہ افسانہ سرینگر سے نکلنے والے جریدے آزاد میں شائع ہوا لیکن یونانی حکیم سے پہلے بھی انھوں نے ایک افسانہ محبت کا بھوکا کے عنوان سے لکھا تھا جو اسی زمانے میں تلف ہوگیا اور کہیں شائع نہیں ہوا میرے پوچھنے پر اختر صاحب نے اپنے ابتدائی ادبی سفر کے بارے میں بتایا:

"یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ میں افسانہ نگاری کی طرف کیوں مائل ہوا۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ بچپن سے ہی میری زندگی میں ایک خلا سا پیدا ہوگیا تھا میری ماں مرگئی تھی اور میں نسوانی محبت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا تھا تو پہلا افسانہ جو میں نے لکھا بدقسمتی سے وہ کہیں گم ہوگیا ہے۔ اب مجھے معلوم بھی نہیں ہے کہ اس میں میں نے کیا لکھا تھا۔ اس کا نام بھی میں نے رکھا تھا۔ محبت کا بھوکا۔ یہ ہے میرے محرکات میں سے سب سے بڑا محرک افسانے کی طرف راغب کرنے کا۔" [۱]

بعد میں اختر نے اردو میں بہت سارے افسانے لکھے جن میں رات مرگئی، پیوند، بونڈ ریڈ، چھلاوا وغیرہ ذکر کے قابل ہیں۔ یہ اختر کے وہ افسانے ہیں جو تقریباً چالیس سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی سدا بہار ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری اپنی کتاب میں اختر کے ابتدائی افسانوی سفر کے بارے میں رقمطراز ہیں:

اختر محی الدین کشمیر کے مشہور افسانہ نگار اپنے اور بہت سے معاصرین کی طرح ابتدا میں اردو میں لکھتے تھے..... نئے فنی شعور، سماجی احساس اور زندگی کی حقیقی قدروں کی جھلک اُن کے ان ابتدائی افسانوں میں بھی ملتی ہے جو اُردو میں لکھے گئے ہیں۔ ان کے اندازِ بیان اور مسائل کی پیشکش میں بھی موجودہ عہد کی خصوصیات ملتی ہیں۔" [۲]

۱۔ اختر محی الدین سے ایک ملاقات۔

۲۔ کشمیر میں اردو (تیسرا حصہ) از پروفیسر عبدالقادر سروری۔ ص ۱۸۲۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اختر کا افسانہ رات مرگئی ایک تمثیلی ALLEGORICAL افسانہ ہے۔ اس کے پیش کرنے کا انداز بھی جداگانہ ہے۔ یہ افسانہ اُس زمانے میں کلچرل کانفرنس کے دوماہی رسالے کونگ پوش میں شایع ہوا۔ اختر کے ایک اور افسانے پوند کا ٹریٹمنٹ TREATMENT بھی طنزیہ ہے اور یہ چشمہ شعور کی تکنیک میں لکھا گیا بہت ہی خوبصورت افسانہ ہے۔ پونڈریچ بھی اختر کا ایک نمائندہ افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ملک اور بیرون ملک کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر شایع ہوا ہے اور کراچی کے ماہنامہ افکار میں درج ذیل نوٹ کے ساتھ شایع ہوا ہے۔

"یہ ایک دریافت ہے نئے کہانی کار کی اور کہانی لکھنے کے نئے انداز کی"

اختر کے یہ افسانے بے حد پسند کئے گئے اور وہ بہت ہی قلیل عرصہ میں اُردو کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں شمار ہونے لگے۔ اگر وہ کشمیری زبان کی طرف راغب نہ ہوتے اور اُردو کو ہی اپنی جولاں گاہ بناتے تو پھر بھی وہ کشمیر میں اُردو افسانہ نگاروں میں ممتاز مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ ڈاکٹر برج پریمی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:-

"اختر محی الدین نے اپنے ادبی سفر کا آغاز اُردو افسانہ نگاری سے کیا۔ اس کے بعد وہ کشمیری میں لکھنے لگے۔ کشمیری زبان کے افسانہ نگاروں میں آج اُن کا نام سرِفہرست ہے لیکن اُردو میں اُن کی شروعات کسی طرح بھی کمتر درجہ کی نہیں۔"[1]

اختر محی الدین نے باقاعدگی کے ساتھ سنہ ۱۹۵۵ء میں کشمیری افسانہ نگاری کی طرف توجہ کی۔ تب سے اب تک مسلسل لکھتے رہے۔ شروع میں کشمیر کے معروف ادیب اور دانشور پروفیسر جیالال کول (مرحوم) نے اُن کی حوصلہ افزائی کی اور جب اختر کی کہانی دریائے ہُند بیزار (سُرخ جوڑا) ریڈیو کشمیر سے نشر ہوئی تو بے شمار صاحب ذوق حضرات کے ساتھ ساتھ پروفیسر کول نے بھی اس افسانے کو سراہا اور انہیں دوسرے دن اپنے کالج کی ایک پُروقار محفل میں کہانی سُنانے کی دعوت دی۔ اختر نے اپنے ابتدائی ادبی سفر کے بارے میں میرے استفسار کے جواب میں فرمایا:-

---

[1] جموں و کشمیر میں اُردو ادب کی نشو و نما از ڈاکٹر برج پریمی۔ ص ۳۳۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

"میرے والد صاحب کی امیرا کدل میں دکان ہوا کرتی تھی۔ پروفیسر جیالال کول صاحب کبھی کبھی ہماری دکان پر تشریف لاتے تھے اور میرے والد کو بہت حوصلہ دیتے تھے میرے بارے میں ـــ انہوں نے مجھے ہر وقت حوصلہ دیا جب میں نے اپنا پہلا افسانہ سرینگر ریڈیو اسٹیشن سے پڑھا تو انھوں نے پسند کیا۔ پھر دوسرے دن انھوں نے مجھے کالج میں افسانہ پڑھنے کی دعوت دی۔ میں نے دو افسانے سُنائے۔ پھر کول صاحب نے اُن پر تبصرہ کیا۔ اس طرح سے مجھے بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔" [ل]

اختر کا پہلا افسانوی مجموعہ ست سنگر (سات چوٹیاں) کے نام سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں اُن کے سات افسانے دانہ وزن۔ دریائے ہند ہیزار، چھونا سیدان، مرتہ تو گ نہ کنہ، زتھ، کچھوہ، ستلہ داؤ وغیرہ شامل ہیں۔ اختر اس لحاظ سے کشمیری افسانے کے پیش رو تصور کئے جاتے ہیں کہ انھوں نے سب سے پہلے اپنے کشمیری افسانوں کا مجموعہ ست سنگر (سات چوٹیاں) کے نام سے شائع کیا اور اپنے معاصرین کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس مجموعے پر انہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

اختر محی الدین کے افسانوں میں اقتصادی بدحالی معاشی غلامی غربت و افلاس اور سماجی نابرابری کے ملے جلے جذبات ملتے ہیں۔ دندہ وزن اختر کی ایک بہترین کہانی ہے بقول شمیم احمد شمیم یہ نچلے طبقے کی معاشرت کی ایک صحیح تصویر ہے اور پھر اس تصویر میں اختر نے مختلف رنگوں کے امتزاج سے جو گہرائی اور شدت پیدا کی ہے۔ وہ انھی کا حصہ ہے۔ دریائے ہند ہیزار، دو چلتے پھرتے کرداروں نبر شالہ اور خوتن دید کی کہانی ہے جو یوں تو عمر رسیدہ ہیں لیکن انہیں جوانی کی یاد آتی ہے۔ اختر نے اس کیفیت کو نہایت ہی دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ بظاہر یہ ایک نفسیاتی افسانہ ہے اور ماضی کی حسین یادوں کو آنکھوں کے سامنے لاتا ہے۔

چھونا سیدان اور مرتہ تو گ نہ کنہہ اختر محی الدین کے دو طنزیہ افسانے ہیں۔ اگرچہ یہ سطحی کہانیاں ہیں لیکن خیالات کے بہاؤ سے اور کرداروں کی حرکت سے اول سے آخر تک دلچسپی قائم رکھتی ہیں۔ ستلہ داؤ موپساں کی کہانی سے ماخوذ ہے۔ اختر کی کہانیوں

ل۔ اختر محی الدین کے ساتھ ایک ذاتی گفتگو سے۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

میں عام طور پر کشمیری فضا رچ بس گئی ہے۔ اُن کے کردار خالص کشمیری ہوتے ہیں کبھی کبھی جب وہ کشمیر سے باہر کی بات کرتے ہیں اور اُس فضا اور ماحول کو اپنے افسانوں میں جگہ دیتے ہیں جو غیر کشمیری ہے تو اس صورت میں کرداروں کا خاص خیال رکھتے ہیں اور یہی چیز انہیں اپنے معاصرین سے جداگانہ حیثیت عطا کرتی ہے کشمیری زبان کے ممتاز شاعر اور کہانی کار جناب امین کامل اختر کے اس وصف پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں :-

> اختر کو اپنے مزاج نے ساتھ دیا تو انھوں نے سماج کے اُن افراد پر نظر ڈالی جو فرضی دنیا کے بجائے حقیقی دنیا میں چلتے پھرتے ہیں۔ اس طرح سے اُن کے افسانوں میں صحیح طور پر کشمیری فضا اور مزاج اُبھر کر آیا ہے اُن کے کرداروں میں پڑھنے والوں نے پہلی بار لوگوں کے سامنے پایا یہی چیز اختر کے افسانوں نے کشمیری افسانوں کو عطا کیا ہے [1] (کشمیری سے ترجمہ)

اختر محی الدین کا دوسرا افسانوی مجموعہ سن سنزل (اندر دھنش) کے نام سے ۱۹۵۷ء میں شایع ہوا۔ اس میں اُن کے قابل قدر افسانے ہیں لیکن مہادہ جو ولد رسول جو، وانگیج پرنگ اور تیمبہ دوہ جیسے اختر کے افسانوں کے لئے یہ مجموعہ ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ تیمبہ دوہ (آخری دن) میں اختر اپنے لڑکپن کو یاد کرتے ہیں اور انہی یادوں کے سہارے زندگی کی پیچیدگیوں کا قلع قمع کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر ششی شیکھر توشخانی اپنی کتاب میں اختر کی کہانیوں کے اس مجموعے کو اُن کی کتھا یاترا کا دوسرا پڑاؤ تصور کرتے ہیں۔ اُن کے مطابق اختر کے قلم میں اُن سے زیادہ ٹھوس ثبوت ملتے ہیں۔ انہیں اختر سے بڑی توقعات وابستہ ہیں اختر محی الدین کے افسانوں میں پلاٹ کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ وہ اپنے افسانوں میں عام انسان کی نفسیات بیان کرتے ہیں اور یہ ان کی کامیابی کی ایک مثال ہے شیرازہ کے تواریخ میں انھیں روایت شکن افسانہ نگار قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کے مرتبین اختر صاحب کے ان خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں : "خوش قسمتی سے اس کے بعد کشمیری افسانے کو اختر محی الدین (۱۹۲۸ء) جیسے پہلے حقیقت پسند افسانہ نگار ملے۔ جنھوں نے حقیقت میں کشمیری افسانے کو تخیلی دنیا سے باہر نکال کر عام زندگی کی طرف لایا اگرچہ انھیں شروع ادبی شناخت میں ایک خاص پسند رہی ہے مگر انھوں نے

---

[1] از بک کاشر افسانہ (شیرازہ) ترتیب۔ امین کامل ۱۹۶۷ء ص ۷۰

[2] کشمیری ساہتیہ کا اتہاس [illegible] از ڈاکٹر ششی شیکھر توشخانی [illegible]

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

پہلی بار اپنے افسانوں میں دکھایا کہ انسان میں دو پہلو موجود ہیں۔ اختر محی الدین اس لحاظ سے روایت شکن افسانہ نگار ہیں"۔[1] لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا ہے کہ "سونزل" کے پیش نظر اختر ایک باصلاحیت اور سلجھے ہوئے افسانہ نگار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اُن کے کرداروں میں زیادہ تازگی اور توانائی پیدا ہو گئی ہے۔ اُن کے پلاٹ عام زندگی کے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ زبان منجھی ہوئی ہے اور مکالمے برجستہ اور صاف ستھرے ہیں۔

اختر محی الدین ناول نگاری کے میدان میں بھی اپنے نقش پا چھوڑ چکے ہیں۔ اُن کا ایک ناولٹ "زوِ نہ زولانہٕ" (زندگی اور زنجیریں) بھی شائع ہو چکا ہے اور اس کا شمار کشمیری زبان کے نمائندہ ناولوں میں ہوتا ہے۔ اس ناول کا پلاٹ بظاہر ایک سیدھا سادہ پلاٹ ہے جس میں ہمارے معاشرے کا درد و کرب سمٹ کے آیا ہے۔ یہ ایک ایسے آدمی کی کہانی ہے جس کو غربت، افلاس اور لاچاری نے مفلوک الحال بنا کے رکھ دیا ہے وہ چوروں کے گروہ میں شامل ہو کر جگہ جگہ ڈاکے ڈالتا ہے اور اپنی بیوی اور اپنے چھوٹے بچے کا پیٹ پالتا ہے۔ لیکن ایک دن وہ چوری کرتے کرتے ایک مکان کی چھت سے گر جاتا ہے اور مر جاتا ہے۔ باقی چور اُس کے گھر جا کر اُس کی بیوی کو یہ اطلاع دیتے ہیں کہ اُس کا شوہر مر گیا ہے۔ وہ بے سہارا ہو جاتی ہے — یہ لوگ اُسے اطمینان دلاتے ہیں کہ وہ اُس کی اور اس کے چھوٹے بچے کی پرورش کریں گے لیکن اس شرط پر کہ اُس کا بیٹا جوان ہو کر چوری اور ڈاکہ ڈالنے کے کام میں اُن کا ہاتھ بٹائے اور اُن کے ہی گروہ میں شامل ہو جائے لیکن وہ صاف انکار کرتی ہے۔ دراصل وہ اپنے بیٹے کو اُس غلط راستے سے دور رکھنا چاہتی ہے جس غلط راستے کو اُس کے شوہر نے اپنایا تھا۔ وہ اُس کو انسان بنانا چاہتی ہے جو ملک اور قوم کی بھلائی کے کام آ سکے اور جس پر سماج فخر کر سکے۔ اس لئے وہ اپنے بیٹے کو ایک ایسے آدمی کے ساتھ مزدوری کرنے کے لئے لنڈی کوتل بھیج دیتی ہے جو افغانستان کا سرحد ہے۔ یہ خالص ایک قبائلی علاقہ ہے جہاں شریف انسان کا رہنا اُس کے بس کی بات نہیں لیکن وہ اپنی شرافت، ایمانداری اور خلوص کی وجہ سے اس علاقے میں بہت ہی ہردلعزیز ہو جاتا ہے اور اپنی محنت، لگن اور ایمانداری سے کافی دولت

۱۔ کاشر ادبک تواریخ، ترتیب: تاجی سورہ، تنقیح: شفیع شوق، ص ۲۲۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh. Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کماتا ہے لیکن اس کا غلط استعمال ہرگز نہیں کرتا بلکہ غریبوں اور لاچاروں کی مدد کرتا ہے۔ یہ ناولٹ فیلڈ سروے آرگنائزیشن کی طرف سے شایع ہونے والے ہفتہ روزہ اخبار چمن سرینگر میں ایک عرصہ تک قسط وار شایع ہوتا رہا۔

اختر کا ایک اور ناول دُود تہ دَگ ۱۹۵۵ء میں شایع ہوا۔ پروفیسر جیا لال کول نے اس کا انگریزی ترجمہ PAIN AND ANGUISH کے نام سے کیا ہے۔ اس میں بھی اختر کے رنگا رنگ کردار دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس ناول کا پلاٹ بھی کشمیر کے ایک گھرانے کے گرد گھومتا ہے۔ فنی لحاظ سے بھی یہ ایک مکمل ناول ہے دُود تہ دَگ اپنے زمانے کا مقبول ترین ناول ہے۔ یہ دراصل دو یتیم بہنوں کی کہانی ہے۔ ان میں سے ایک تپ دق کا شکار ہو چکی ہے۔ سماج میں ان کو نیچ نظر سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ وہ بے سہارا ہیں۔ ایک چالاک آدمی اُن کا استحصال کرتا ہے اور اُن کی بے بسی کا فائدہ اُٹھاتا ہے لیکن کسی کو اُن سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ یہ دراصل دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں لکھا گیا ناول ہے جس میں اقتصادی کشمکش اوّل سے آخر تک محسوس کی جا سکتی ہے۔ اسی اقتصادی کشمکش کے دوران ان دو بہنوں پر کیا بیتتی ہے۔ یہ اس ناول کا پلاٹ ہے۔ بشیر اختر ناول دُود تہ دَگ کو خالص رومانی ناول قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"یہ ایک رومانی ناول ہے جس میں دو کرداروں کا رومانس اور اس رومانس کے متعلق سماج کا ردِ عمل وغیرہ بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔"[1]

اختر محی الدین نے افسانے اور ناول نگاری کے ساتھ ساتھ ڈرامہ نگاری میں بھی امتیازی مقام حاصل کیا ہے۔ اُن کے بے شمار ڈرامے ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔ اُن کے مطابق یہ ہمیشہ تھیم پر ہی منحصر ہوتا ہے کہ فارم کون سا رُخ اختیار کرے۔ بعض ایسے تھیم ہوتے ہیں جو ڈرامے کی ہی شکل میں پیش کئے جا سکتے ہیں تو اس وقت ڈرامائی کاغذ پر انڈیلا جا سکتا ہے لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ تھیم جو واقعات میں تسلسل پیدا کر کے بہت سے واقعات کے گرد گھوم کر ہی پیش ہوتے ہیں تو اس وقت ناول ہی قلم کی نوک سے نکل کر بیان ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ خود اپنے ناول کو حقیقی معنوں میں ناول کے زمرے

---

[1] کشمیر [illegible] ادب ۱۹۶۰ء [illegible]

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation Chandigarh. Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

میں نہیں رکھتے ہیں بلکہ اس کو LONG SHORT STORY لانگ شارٹ اسٹوری کہتے ہیں۔ اُن کے مطابق ناول کا کنواس بہت بڑا ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کشمیری زبان میں صرف غلام نبی گوہر کے ایک دو ناولوں کے کنواس بہت بڑے ہیں۔ اُن کے ناول کو صحیح معنوں میں ناول کہا جا سکتا ہے۔ باقی کشمیری زبان میں اُس قسم کا ابھی تک کوئی بھی ناول نگار پیدا نہیں ہوا ہے جو حقیقی معنوں میں ناول کا تقاضا پورا کر سکے۔[۱]

اختر محی الدین نے سوویٹ یونین کی سیاحت بھی کی ہے۔ واپسی پر انھوں نے سلاوِ امَر یعنی GLORY TO PEACE کے عنوان سے کشمیری زبان میں سفر نامہ لکھا جو انہی دنوں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ وہ ایک عرصہ تک ریاستی کلچرل اکادمی کی طرف سے شائع ہونے والے شیرازہ (کشمیری) اور سون ادب بھی ایڈیٹ کرتے رہے۔ وہ پشکر بھان کے ساتھ مل کر لوک کہانیوں پر مبنی ایک مجموعہ بھی ترتیب دے چکے ہیں۔ اختر وقتاً فوقتاً بعض اچھے خاکے بھی لکھ چکے ہیں، جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔

اختر محی الدین کی زبان بڑی دلکش ہے۔ وہ ٹھیٹھ کشمیری الفاظ استعمال کرنے کے قائل بھی ہیں اور آسان اور عام فہم الفاظ اور تراکیب بھی۔ اُن کی کہانیوں میں منظر نگاری کا انوکھا جوہر ملتا ہے۔ فلک بوس پہاڑوں کا منظر ہو یا کشمیر کے دریاؤں اور ندی نالوں کا، لہلہاتے کھیتوں اور کھلیانوں کی مصوری ہو یا رنگ برنگے پھولوں اور میوؤں سے لدے ہوئے باغات کی اختر کا قلم تصویریں کھینچتا ہوا رواں دواں چلتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ اختر کی مصوری قابلِ داد ہے بلکہ وہ معاشرے کے اندر پھیلے ہوئے ناسور کا بھی بڑے دل نشین انداز سے احاطہ کرتے ہیں۔ جہیز کی بدعتوں سے دلہن پر ڈھائے گئے مظالم ہوں یا در در بھٹکتے ہوئے تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوان، دور دراز دیہاتوں میں بسنے والے غریب اور لاچار کسان ہوں یا سوزن کاری اور اخروٹ کی لکڑی پر کھدائی کا کام کرنے والے کاریگر ـــ اختر محی الدین اس طبقے کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ اختر کی تشبیہات و استعارات بھی خالص کشمیری ہیں۔ ان کے افسانوں میں بڑی جاندار علامتیں بھی ملتی ہیں۔ اختر کا فن پیچیدگی کا فن نہیں۔ نہ اُن کا مقصد قاری کو گورکھ دھندے میں ڈالنا ہے۔ وہ جذبے کے فنکار ہیں۔ اس لئے جلد ہی لوگوں کے دکھ درد کو محسوس کرتے ہیں۔ ڈاکٹر برج پریمی اپنی کتاب میں اختر کے ان افسانوں کو موضوع اور ہیئت کے لحاظ سے اہم افسانے

---

[۱] اختر محی الدین کے ساتھ ایک ذاتی گفتگو۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

قرار دیتے ہیں۔ وہ ایک جگہ پر رقمطراز ہیں:۔

> "اختر محی الدین نے اسی دور کے آس پاس بڑے اہم افسانے لکھے۔ دری یا بہ ہند بیزار، دندوزن، داغ، آدم چھ عجب ذاتھ، اس دور کے افسانوی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نہ صرف موضوع کے اعتبار سے بلکہ تیکنیک کے اعتبار سے بھی یہ افسانے اہم ہیں۔ پلاٹ کی بُنت، کرداروں کی تہہ داری، مکالموں کی برجستگی اور اسلوب کی شادابی نے ان افسانوں میں حسن اور اثر پیدا کیا۔" لہ

"اختر محی الدین نے اپنے افسانوں پر کسی سے اصلاح نہیں لی بلکہ خود اپنے مطالعے کو اپنا رہنما بنایا۔ وہ ایک ایسے ذہین فن کار ہیں جنہوں نے خلوص دل سے کشمیری افسانے کی آبیاری کی ہے۔ اُن کے مطابق اگر تنقید صحت مند ہو تو فن کار کے قلم میں تازگی اور توانائی آسکتی ہے۔ اُنہیں باہر کے لکھنے والوں سے شکائیت ہے کہ وہ کشمیر سے تعلق رکھنے والے فن کاروں کے ساتھ امتیاز برتتے ہیں اور انہیں خاطر میں نہیں لاتے۔ اختر انگریزی زبان وادب سے بھی کماحقہٗ واقفیت رکھتے ہیں۔ انگریزی افسانہ نگاروں میں وہ سٹیونسن کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ ماحول کے ساتھ ساتھ واقعات پیش کرنے کا صحیح گر رکھتے ہیں۔ وہ کافکا کو بھی پسند کرتے ہیں کیوں کہ اُن کے افسانوں میں اختر کو حقیقت اور خواب تحلیل ہوتے ہوئے نظر آجاتے ہیں۔

کشمیری زبان وادب میں اُن کے پسندیدہ افسانہ نگار ہری کرشن کول ہیں۔ وہ ہردے کول بھارتی کے افسانے بھی بڑے شوق اور انہماک سے پڑھتے ہیں۔ پریم ناتھ پردیسی کو اختر خالص کشمیری زبان کے افسانہ نگار قرار دیتے ہیں۔ اُن کے مطابق پردیسی (مرحوم) کے افسانوں کے کردار کشمیری ہیں۔ اُن کے افسانوں کا کینڈا خالص کشمیری ہے۔ اُن کی پیش کاری بھی کشمیری ہے اور وہ جو اپنے افسانوں میں تلمیحات استعمال کرتے ہیں۔ وہ بھی کشمیری ماحول سے ماخوذ ہیں۔ اختر صاحب کے مطابق چونکہ پردیسی کے دور میں کشمیری زبان میں افسانہ لکھنے کی روائیت نہیں تھی۔ اسی لئے انھوں نے اُردو کا راستہ اپنایا تھا ورنہ وہ مزاجاً کشمیری زبان کے افسانہ نگار ہی تھے۔" لہ

لہ۔ مباحث۔ از ڈاکٹر برج پریمی۔ ص ۸۳۔
لہ۔ اختر محی الدین کے ساتھ ایک ذاتی گفتگو۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

جدید افسانے کے بارے میں بھی وہ واضح نظریہ رکھتے ہیں لیکن وہ ایسے جدید افسانہ نگاروں کو پسند نہیں کرتے جو جدیدیت کے نام پر قاری کو گمراہ کرتے ہیں۔ اُن کے مطابق جدیدیت نے ایک ایسے افسانہ نگاروں کی جماعت پیدا کی ہے جو سرے سے ہی افسانہ نگار نہیں بلکہ وہ صرف الفاظ جمع کرتے ہیں اور پھر اُن میں تنہائی، بےکسی، بےبسی اور ذات کا کرب کا اظہار کرتے ہیں اور کردار، پلاٹ، واقعات اور عمل اور ردِعمل کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ کشمیری زبان کے افسانے سے مایوس نہیں۔ اُن کے مطابق کشمیری افسانے کا مستقبل روشن اور تابناک ہے۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

لداخ کا ایک معروف قلم کار
عبدالغنی شیخ

ریاست جموں کشمیر میں اُردو افسانے کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں تاہم جن افسانہ نگاروں نے اپنے ذہن رسا سے اس فن کو آگے بڑھایا۔ ان میں پریم ناتھ پردیسی، راماننذ ساگر، قدرت اللہ شہاب، نرسنگھداس نرگس، کشمیری لال ذاکر، ٹھاکر پونچھی، موہن یاور، برج پریمی، بنسی نردوش، دیپک کول، شیخ بہادر رہبان، حامدی کاشمیری، پشکر ناتھ، ہری کرشن کول، نورشاہ وغیرہ پیش پیش ہیں۔ اس فہرست میں عبدالغنی شیخ کا نام بھی لیا جاسکتا ہے جنھوں نے اپنے افسانوں میں لداخ کی تہذیب اور اس کے کلچر کا رنگ بھر دیا ہے اور موضوعات میں تنوع پیدا کیا۔

عبدالغنی شیخ ۱۹۳۶ء کو دنیا کے بلند ترین مقام لیہہ لداخ میں ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی اسکولوں سے حاصل کی۔ گھر میں افلاس اور ناداری کے سائے ابتدا سے ہی منڈلا رہے تھے لیکن ہمت اور حوصلے سے انھوں نے ان تمام حالات کا مقابلہ کیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ آخر ذریعہ معاش کی تلاش میں سرینگر پہنچ گئے اور وہاں ویٹرنری اسٹاک اسسٹنٹ کی ٹریننگ حاصل کی یہ ۱۹۵۳ء کی بات ہے۔ اپنے مضمون 'یادوں کے لمس' میں اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے خود رقمطراز ہیں:

> "۱۹۵۳ء کی بات ہے کہ میں سرینگر میں ویٹرنری اسٹاک اسسٹنٹ کی ٹریننگ حاصل کر رہا تھا۔ میٹرک پاس کیا تھا۔ آگے پڑھنے کا شوق تھا لیکن غربت کی وجہ سے کالج میں داخلہ نہیں لے سکا۔" [۱]

عبدالغنی شیخ نے زندگی میں بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔ انھوں نے مُلازمت کے ساتھ

---

[۱] ۔ برج پریمی ۔ایک مطالعہ مرتبہ پریمی رومانی، ص ۱۷،

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ساتھ پڑھنے کا شغل بھی جاری رکھا اور اس طرح سے کئی امتحانات پرائیویٹ طور پر پاس کئے۔ اسی دوران وہ وزارت اطلاعات و نشریات کے ساتھ وابستہ ہوگئے اور یہاں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ مطالعہ اور کتب بینی کا چسکہ بچپن سے ہی اُن کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا چنانچہ ابتدا سے ہی انھوں نے چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور افسانے لکھنے شروع کئے اور یہ سلسلہ اب تک جاری و ساری ہے۔ ان کے متعدد افسانے، ڈرامے، خاکے اور مضامین ملک کے معیاری رسائل میں چھپ چکے ہیں اور مقبول عام ہو چکے ہیں۔ شیخ ترقی پسند نظریات کے حامی ہیں اور کرشن چندر سے کافی متاثر ہیں اُن کے بارے میں ایک جگہ پر لکھتے ہیں:-

"کرشن چندر کا نام جب لیا جاتا ہے تو ذہن باغ و بہار ہو جاتا ہے اور آنکھوں کے سامنے جلوۂ حسن ہزار رنگ کی طرح ایک رنگین چمن کا سماں کھنچ جاتا ہے جس میں رنگ برنگے پھول کھلے ہیں اور شوخ و شنگ تتلیاں فضا میں جھوم رہی ہیں۔ یہ جان دار تاثرات کرشن چندر کے خوبصورت الفاظ عطا کرتے ہیں جو کہانیوں اور ناولوں کے روپ میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔"[۱]

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ عبدالغنی شیخ شروع میں کمال لداخی کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ اُن کے کئی ابتدائی افسانے اسی نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کا ایک افسانہ لوسر اور آنسو ۱۹۵۸ء میں ماہنامہ دلیش، سرینگر میں شائع ہوا جس کے ادارتی فرائض میرے والد محترم ڈاکٹر برج پریمی (مرحوم و مغفور) انجام دیتے تھے۔ اس زمانے میں ملک میں اُردو ادبی رسائل کا اکال تھا۔ رسائل نکلتے تھے جو گروہ بندی کا شکار ہوتے رہے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی تھی۔ ایسے میں سرینگر سے ایک ادبی رسالہ نکلنا ایک نیک فال ثابت ہوا۔ عبدالغنی شیخ (کمال لداخی) ایک نیا ادبی رسالہ دیکھ کر خوش ہوئے۔ اس خوشی کا اظہار وہ والد کے نام اپنے ۱۶ را پریل ۱۹۵۸ء کے خط میں یُوں کرتے ہیں:-

"گرامی نامہ ملا اور بڑی مسرت کے درمیان یہ پڑھا کہ اخبار سہ روزہ دلیش، سرینگر نے ایک رسالہ اجرا کیا ہے۔ ایسے ہی ایک رسالے کی بڑی ضرورت تھی۔ وطن کے ادیبوں کے پاس ہمیشہ تخلیقات رہتی ہیں لیکن کوئی ایسا ادبی

لہ۔ ماہنامہ شاعر بمبئی، کرشن چندر نمبر، ص ۲۲۹۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ماہنامہ نہیں جو مستقل طور پر ان تخلیقات سے وطن اور بیرونِ وطن کے لوگوں کو روشناس کرائے اور یہ کتنی المناک حقیقت ہے۔ خدا کرے ہمارا یہ ماہنامہ ہمارے سابقہ دوسرے رسائل کی طرح پہلی ہی منزل پر دم نہ توڑ دے اور سابقہ خامیوں کی تلافی کرے۔" لے

عبدالغنی شیخ بہ یک وقت ایک افسانہ نگار بھی ہیں اور ناول نگار بھی، سوانح نویس بھی اور محقق بھی لیکن افسانہ اُن کا پہلا عشق ہے۔ وہ اس وقت تک متعدد افسانے لکھ چکے ہیں جو ملک کے مختلف اخبارات اور جرائد کی زینت بن چکے ہیں۔ لکھنے کا شوق انہیں بچپن سے تھا۔ اپنے ادبی سفر کے آغاز کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:۔

"سری نگر میں اُن دنوں گاہے گاہے کسی ہوٹل یا کسی ادیب کے گھر ادبی مجلس منعقد ہوا کرتی تھیں۔ جلد ہی مجھے اُن کی بُو باس مل گئی اور میرا ادبی ذوق مجھے اُن مجلسوں میں کھینچ لے گیا۔ ادب کا چسکا میں لیہہ سے اپنے ساتھ لایا تھا اور لکھنے کی چھوت بھی لگی تھی لیکن یہ چھوت بڑی خوبصورت اور نفع بخش تھی اس نے مجھے حوادثِ زمانے کا مقابلہ کرنے، جینے اور زندگی میں آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔" لے

'زوجی لا کے آر پار' عبدالغنی شیخ کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس میں اُن کی ابتدائی کہانیاں شامل ہیں۔ ان افسانوں میں شیخ نے طبقاتی کشمکش، سماجی نابرابری، رشوت خوری اور ظلم و تشدد کو موضوع بنایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان افسانوں میں پیار و محبت کی جھلکیاں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ اگرچہ ان افسانوں میں شیخ کا فن اپنے جوبن پر نظر نہیں آتا لیکن پھر بھی فکر کی جلوہ سامانیاں جا بجا نظر آتی ہیں۔

عبدالغنی شیخ کا دوسرا افسانوی مجموعہ 'دوراہا' ابھی حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ یہ ۲۲ افسانوں پر مشتمل ایک خوبصورت گلدستہ ہے۔ اس میں وہ ایک نئے جوش اور ولولے کے [illegible] سامنے آتے ہیں۔ ان افسانوں کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ شیخ منجھے ہوئے کہانی کار ہیں۔ بظاہر مختلف اوقات میں لکھی گئی کہانیاں ہیں لیکن ان میں پلاٹ سازی، کردار نگاری، واقعہ نگاری، منظر نگاری کے ساتھ ساتھ فکر و فن کی تازگی بھی ملتی ہے۔ یہ اُس سرزمین کی کہانیاں ہیں جہاں

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh. Funding by IKS-MoE-2025-Grant

لے ماہنامہ شیرازہ سری نگر ۱۹۵۸ء [illegible]

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کے لوگ سیدھے سادے محنتی اور حسن و اخلاص کے پیکر ہیں۔ یہ خطہ ریاست کے دوسرے خطوں سے مختلف ہے۔ یہاں کا رہن سہن، لباس، کلچر اور تہذیب اسلامی اور بودھی روایات کا سنگم ہے۔ چنانچہ ان تمام چیزوں کی عکاسی عبدالغنی شیخ کے افسانوں میں نظر آتی ہے — عبدالغنی شیخ کو اپنے اور وطن لداخ سے والہانہ عشق ہے۔ انہیں اس کا کلچر، تہذیب اور تمدن بڑا عزیز ہے۔ اپنے ایک خط میں میرے والد مرحوم کو لکھتے ہیں:۔

"لداخ میرا وطن ہے۔ یہاں کے تمدن و معاشرت کی نیرنگیاں میرے ذہن میں آج بس گئی ہے۔ ہر گھر کے کنج اور ہر کوچے کی نکڑ پر مجھے یہاں کی معاشرت سے متعلق کہانیاں بکھری ملتی ہیں۔ اور میں ان کی عکاسی کرنا اپنا پہلا فرض جانتا ہوں۔ آپ مجھ سے اور کہانیاں ڈرامے وغیرہ طلب کر سکتے ہیں جو یہاں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے نقاب اٹھاتی ہیں۔" لہ

عبدالغنی شیخ کو افسانوی تیکنیک پر پوری گرفت ہے۔ وہ مبہم اور غیر واضح بیانات سے گریز کرتے ہیں۔ ان کے ہاں بے جا عبارت آرائی بھی نہیں ملتی۔ وہ اپنی کہانیوں میں فلسفہ نہیں بگھارتے بلکہ جچے تلے انداز میں بات کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ لداخ میں بیٹھ کر کبھی دلی یا کسی اور شہر کی بات نہیں کرتے بلکہ ارد گرد کے ماحول کو پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں — ان کے کردار جانے پہچانے کردار ہوتے ہیں۔ وہ کبھی فرسودہ اور غیر متحرک کرداروں کو پیش نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کے کردار افسانے کے پلاٹ کے گرد کچھ اس طرح گھومتے ہیں کہ ایک جانی پہچانی دنیا آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ علی باقر ان کی کردار سازی پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"عبدالغنی شیخ کے تخلیق کردہ کردار عام زندگی سے لئے گئے ہیں اور جیتے جاگتے صحت مند اور توانا لگتے ہیں۔ وہ حالات کے نابینا غلام نہیں ہیں اور سماج اور تہذیب کے بلند رتبوں تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ شیخ حقیقت نگاری کے قائل ہیں اور اپنے کرداروں کے احساسات، نفسیات اور ماحول سے خوب واقف ہیں۔" لہ٢

عبدالغنی شیخ کے افسانوں کے موضوعات میں تنوع ہے۔ اس میں پیار و محبت کی دھیمی

لہ ماہنامہ دریش، سرینگر ۱۹۵۸ء ص ۱۲ ؛ لہ٢ دوراہا۔ از عبدالغنی شیخ :

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

دیکھی آنچ بھی ہے اور سماجی نابرابری کا احساس بھی ظلم و تشدد کے واقعات بھی ہیں اور وطن سے محبت بھی۔ بعض کہانیوں میں بھرپور طنز ملتا ہے۔ وہ سماج، سوسائٹی اور فرد پر کبھی کبھی طنز کے تیر بھی چلاتے ہیں۔ شیخ کے افسانوں میں ڈرامائیت بھی ملتی ہے۔ اس ضمن میں رشتے ناطے قابل دل ہی تو ہے، نہتے ہاتھ، بانجھ، مقابلہ، آزمائش، دوراہا اور ہوا جیسے افسانے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ چند نمائندہ افسانوں کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے جن میں لداخ کے ماحول اور اس کے کلچر اور تہذیب کی نمائندگی کی گئی ہے۔ مثلاً:

"چھنگ (جو کی شراب) کے کئی جام چڑھانے کے بعد اس کا دماغ آسمان پر پہنچ گیا اور وہ اونچی اونچی آواز میں باتیں کرنے لگا۔ عورت بار بار اس کا ساغر بھرنے لگی۔ پندرہ پیالیاں لینے کے بعد جب عورت نے خالی جام بھرنے کے لئے دوبارہ صراحی اٹھائی تو اس نے اس کا ہاتھ روک لیا۔ جیب سے بٹوا نکالا اور دس دس روپے کے دو نوٹ عورت کو دیئے۔ عورت نے تین روپے واپس کر دیئے جو اس نے احتیاط سے بٹوے میں رکھ لئے۔" (مقابلہ۔ ص ۱۳، ۱۴)

"حامد رک رک کر بولنے لگا لیکن تم نہیں جانتی میری جہاں میں رہتا ہوں وہ جگہ لیہہ سے بالکل بدتر ہے لیہہ میں سیاحوں کی آمد کی وجہ سے بڑی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ یہاں موجودہ زمانے کی ساری بنیادی سہولتیں میسر ہیں لیکن میرے گاؤں میں ابھی کوئی سہولت نہیں کوئی ریستوران نہیں، کوئی ریڈنگ روم نہیں یہاں تک کہ بجلی بھی نہیں۔ دھول گرد، ریت میرے گاؤں کے تحفے ہیں گاؤں تک سڑک بھی نہیں جاتی چنانچہ سنگریزوں اور دھول سے اٹی ہوئی چار کلومیٹر لمبی ایک ڈھلوان پگڈنڈی پیدل طے کرنے کے بعد ہم اپنے گھر پہنچتے ہیں۔"

(آزمائش۔ ص ۲۷)

"نجمہ کی بانجھ ہونے کی بات ساس سسر اور نندوں، بھاوجوں کے بعد اب دادی اماں کی زبان پر اکثر آنے لگی تھی۔ نجمہ نے محسوس کیا کہ کچھ دن سے اس کے ساتھ گھر میں ایک سرد مہری سی برتی جا رہی ہے۔ اس نے کئی مرتبہ نندوں اور بھاوجوں کو کانا پھوسی کرتے دیکھا جب وہ ان کے پاس جاتی تو وہ خاموش ہو جاتیں پہلے پہل تو وہ ان کے رویہ پر پریشان ہوئی لیکن اب وہ بات

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation Chandigarh Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سمجھ گئی تھی ان سرگوشیوں کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ اس کی گود پچھلے چار سال سے خالی تھی۔ اس کے ساس سسر نے کئی مرتبہ اپنے بیٹے کے اولاد کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ شروع شروع میں ان کے لہجے میں نرمی اور ہمدردی ہوتی تھی۔ لیکن اب اُن کے لہجے میں ملامت اور تہمت جھلکتی تھی۔"

(باٹجھ ۔ ص ۱۱۴)

عبدالغنی شیخ ایک اچھے ناول نگار بھی ہیں۔ "وہ زمانہ" اُن کا لداخ کے ماحول اور اس کی تہذیب اور کلچر پر ایک تاریخی ناول ہے۔ اُن کا دوسرا ناول "دِل ہی تو ہے" ہے جو ۱۹۷۶ء میں چھپ کر سامنے آیا۔ یہ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو لداخ کی ایک دوشیزہ کے زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا ہے لیکن پھر جب اُن کی محبت کے درمیان میں ایک اور کردار آتا ہے تو یہ کہانی نیا رُخ اختیار کرتی ہے۔ شیخ کا ناول "دِل ہی تو ہے" سونم اور پدماں کی محبت کی داستان ہے۔ انھوں نے اس محبت کو خالص لداخ کے پس منظر میں پیش کیا ہے اور کامیابی سے زینہ بہ زینہ طے کر کے اس داستان کو ایک ایسے موڑ پر لایا جہاں خود بخود تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ دراصل سماج کا ٹکراؤ ہے اس میں نیماں کا کردار داخل ہونے سے کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ لیہہ کے ماحول اور یورپی سیاحوں کے پس منظر میں لکھا ہوا یہ دلچسپ رومانی ناول ہے۔

عبدالغنی شیخ نے نہ صرف افسانہ نگاری اور ناول نگاری میں ہی اپنی طبیعت آزمائی ہے بلکہ انھوں نے بحیثیت ایک سوانح نویس کے بھی قابلِ قدر نام پیدا کیا ہے۔ اُن کی کتاب "صنم نربو" بھی ایک اچھی کوشش ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ملک کے سرکردہ انجینئر، سفیر اور سیاستدان مرحوم صنم نربو کے کارناموں کو لوگوں کے سامنے رکھا ہے۔ جنھوں نے اپنی خداداد صلاحیت سے سرینگر سے لیہہ جانے والی قومی شاہراہ تعمیر کر کے ایک شاندار کارنامہ انجام دیا ہے۔ اُن کے ادب، ثقافت اور لداخی کلچر اور تاریخ پر متعدد مضامین شائع ہو چکے ہیں جو اپنی جگہ مسلمہ ہیں۔

ماہنامہ "تعمیر" سرینگر
اکتوبر ۱۹۹۳ء

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منظر اعظمی - چند تاثرات

ریاست جموں و کشمیر نہ صرف اپنی خوبصورتی کے لئے دُنیا بھر میں مشہور ہے بلکہ یہ ریاست ثقافت، تہذیب اور کلچر کے لئے بھی صدیوں سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ یہاں کے صحت مند اقدار اور ادبی وراثت نے ہر وقت دُنیا بھر کے عالموں، فاضلوں، دانشوروں اور فن کاروں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ ادب اور شاعری کی بات ہو تو ایسے بے شمار لوگوں کے نام ذہن میں آتے ہیں جنہوں نے اس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ آنند لال چکبست، منٹو، سرشار، چراغ حسن حسرت، قدرت اللہ شہاب، دینا شنکر نسیم، تربھون ناتھ ہجر، علامہ کیفی، آغا حشر کاشمیری، راما نند ساگر، محمد عمر نور الٰہی، رفیق خاور وغیرہ صرف چند نام ہیں جنہوں نے اپنی تخلیقات سے اُردو شعر و ادب میں رنگا رنگ پھول کھلائے لیکن ان کے علاوہ اُن غیر ریاستی ادیبوں اور شاعروں کا ذکر کرنا بھی ناگزیر ہے جن کا اس سرزمین سے کوئی تعلق نہیں لیکن ان کے ادبی کارناموں کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان حضرات میں اثر لکھنوی، محمد دین تاثیر، محی الدین قادری زور، عبدالقادر سروری، آل احمد سرور، جگن ناتھ آزاد، شکیل الرحمٰن، گیان چند جین، محمد حسن، مسعود حسین خان، عالم خوندمیری، کمال احمد صدیقی، منظر امام اور زبیر رضوی وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ پروفیسر منظر اعظمی کا نام انہی غیر ریاستی ادیبوں میں بڑے احترام کے ساتھ لیا جا سکتا ہے جو گذشتہ کئی دہائیوں سے جموں میں رہ کر اُردو شعر و ادب کی خدمت کرتے رہے ہیں۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منظر اعظمی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم) نے آج سے تقریباً بیس سال قبل اُن کے بارے میں اپنی کتاب میں لکھا ہے :-

" منظر اعظمی جموں کے کئی ادبی اداروں کے سرگرم رکن ہیں۔ وہ اس وقت پوسٹ گریجویٹ شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی میں اُردو کے لیکچرار ہیں۔ اچھے شاعر اور اُردو کے عالم ہیں۔" لہ

منظر اعظمی ایک شاعر بھی ہیں اور نقاد بھی، محقق بھی ہیں اور تبصرہ نگار بھی۔ وہ ادب کے ان تمام شعبوں میں طبیعت آزما چکے ہیں۔ اور قارئین سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اگرچہ اعظمی صاحب کا اب تک کوئی بھی شعری مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا ہے لیکن نثر میں وہ گوناگوں موضوعات پر تصانیف پیش کر چکے ہیں۔ اُردو میں تمثیل نگاری، تلاش و تعبیر، اُردو میں شعری زبان کی اصلاح کی کوشش وغیرہ اُن کی اہم تصانیف ہیں۔ اعظمی صاحب صرف ادب کے جدید رجحانات پر گہری نگاہ رکھتے ہیں بلکہ وہ روایتی اور کلاسیکی شعر و ادب سے بھی خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر برج پریمی اپنی کتاب میں اعظمی صاحب کی صلاحیتوں اور ان کی علمی بصیرت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" ڈاکٹر منظر اعظمی ایک اور ناقد ہیں۔ اردو میں تمثیل نگاری، تلاش و تعبیر، سب رس کا تنقیدی جائزہ وغیرہ اُن کے متعدد تنقیدی کارنامے ہیں۔ منظر کی شگفتہ تحریروں میں ایک صاحب بصیرت ناقد کی روح مچلتی ہے۔ وہ صاف سلجھے اور ستھرے ہوئے انداز میں اپنی بات سناتے ہیں۔" ٹہ

اعظمی صاحب نے جہاں میر، غالب، اقبال، چکبست وغیرہ جیسے اعلیٰ پایہ کے شعرا پر تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھے ہیں وہاں انھوں نے مقامی شاعروں اور ادیبوں پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ انھوں نے منوہر لال دل، حکیم منظور، عابد مناوری، برج پریمی کے علاوہ دیگر نو آموز فن کاروں پر بھی بڑے اچھے اور فکر انگیز مضامین لکھے ہیں۔ اور ان کی ادبی حیثیت متعین کی ہے۔ جموں و کشمیر کے شعر و ادب پر اعظمی صاحب کے متعدد مضامین مختلف

ٹہ - ڈاکٹر برج پریمی - جموں و کشمیر میں اُردو ادب کی نشو و نما ص ۹۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

لہ پروفیسر عبدالقادر سروری : کشمیر میں اُردو (حصہ سوئم) ص ۱۵۷ ؛

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

جرائد و اخبارات میں شایع ہو چکے ہیں جو بے حد پسند کئے گئے۔ وہ وقتاً فوقتاً 'شیرازہ' ہمارا ادب' اور تعمیر سرینگر میں شایع ہوتے رہے۔

اعظمی صاحب میں ایک خاص بات پائی جاتی ہے کہ وہ نوجوان شاعروں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبی صلاحیت اور شاعرانہ رموز نہ صرف خود اپنے آپ تک ہی محدود رکھے ہیں بلکہ وہ علم و ادب کے اس چراغ سے دوسروں کو بھی روشن کرتے ہیں۔ اسی لئے وہ ہماری ریاست کے نوجوان ادیبوں میں مقبول ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں اعظمی صاحب نے اپنے کئی احباب کے ساتھ بزم فروغ اردو کے نام سے جموں میں ایک ادبی انجمن قایم کی۔ اس انجمن کے قیام سے جموں میں ایک نئی ادبی فضا پیدا ہو گئی۔ نوجوان تخلیق کاروں کے ساتھ ساتھ پختہ مشق فن کار بھی اس انجمن کی نشستوں میں باقاعدگی کے ساتھ حصہ لینے لگے۔ ۱۹۶۳ء کے بعد جموں میں اردو ادب کے فروغ میں اس انجمن کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اور بقول اعظمی صاحب کے اردو شعر و ادب سے جتنے بھی نئی نسل کے ممتاز فن کار ہیں وہ کسی نہ کسی پہلو سے اس ادارے سے منسلک رہے ہیں۔[1]

پروفیسر منظر اعظمی نے اگرچہ اپنی ادبی زندگی کا آغاز نثر نگاری سے کیا لیکن شاعری سے بھی وہ ابتدا سے ہی شغف رکھتے تھے۔ تحقیق و تنقید کی طرف بھی انھوں نے شروع سے ہی توجہ کی ہے۔ چنانچہ اپنے تخلیقی سفر کے ابتدائی دور میں ان کے چند اچھے مضامین شایع ہوئے جن میں میر کی غزلوں کا فکری پہلو' اردو ڈرامہ نگاری اور پریم چند' محبت غالب کے کلام میں' اردو ڈرامے کا عکس' اردو غزل کی اہمیت' اردو شاعری اور انیس وغیرہ شامل ہیں۔ یہ مضامین اس لئے بھی پسند کئے گئے کہ ان میں ایک باصلاحیت ناقد اور محقق کی روح بولتی ہے۔ لیکن حقیقی معنوں میں پروفیسر گیان چند جین کی صحبت میں رہ کر اعظمی صاحب میں فکر و نظر کی بالیدگی پیدا ہو گئی جس کا اعتراف وہ خود کرتے ہیں۔ ایک جگہ رقمطراز ہیں:-

"۱۹۶۷ء میں جموں یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں جو سال ڈیڑھ سال پہلے قایم ہوا تھا' اردو لیکچرار کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔ میرے ساتھ عابد پشاوری کا بھی تقرر ہوا تھا جو کامرس کالج میں میری جگہ ملازم ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر گیان چند جین صدر شعبہ اردو تھے۔ ان سے مجھے کافی فائدہ ہوا خصوصاً تحقیقی مضامین

---

[1] ماہنامہ نیا دور' لکھنؤ' نومبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۹۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اور دوسری معلومات کے سلسلے میں ؟ [1]

منظر اعظمی کا پہلا تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ اُردو میں تمثیل نگاری ۱۹۷۷ء میں شایع ہوا۔ اس پر انہیں جموں یونیورسٹی سے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ یہ اس موضوع پر اپنی نوعیت کی اولین کتاب ہے۔ اس میں اعظمی صاحب نے تمثیل نگاری کے تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ اعظمی صاحب نے اُردو کی پہلی تمثیل سب رس کے ماخذوں کی بازیافت میں بڑی کد و کاوش سے کام لیا ہے۔ اس کتاب میں نہ صرف تمثیل نگاری پر بحث کی گئی ہے بلکہ تشبیہہ، استعارہ، کنایہ، رمزیت، علامت نگاری کے ساتھ ساتھ سب رس کے اسلوب، اس کی زبان اور اس کے تمام اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کتاب کے سرنامے میں لکھتے ہیں:۔

"تمثیل نگاری کے موضوع پر اُردو میں یہ پہلی کتاب ہے۔ جسے شایع کرنے کا فخر انجمن ترقی اُردو (ہند) کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر منظر اعظمی نے اس موضوع کے تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔۔۔۔ میری نظر میں اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ تحقیق اور تنقید کا بہترین امتزاج ہے۔" [2]

"تلاش و تعبیر" اعظمی صاحب کی ایک اور کتاب ہے جو رنگا رنگ موضوعات پر دال ہے۔ یہ گیارہ سال کی مدت میں لکھے گئے اُن کے اہم مضامین ہیں۔ ان میں سے بیشتر مضامین ریڈیو جموں سے براڈ کاسٹ ہو چکے ہیں۔ فہرست مضامین پر نظر ڈالتے ہوئے اگرچہ یہ بات شدت سے محسوس کی جاتی ہے کہ اس میں سے بعض مضامین ایسے ہیں جن پر بیسیوں بار خامہ فرسائی کی گئی ہے مثلاً غالب کا تصور عشق، محبوب غالب کے کلام میں، اُمید و یاس، اُردو کی روایتی شاعری میں محبوب کا تصور وغیرہ۔ میرے خیال میں اعظمی صاحب کو اس بات کا خود بھی احساس ہو گا لیکن ان مضامین میں بھی انفرادیت کا کوئی نہ کوئی رنگ جھلکتا ہے۔ اس کتاب میں ان مضامین کے علاوہ اور بھی کئی مضامین شامل ہیں جو موضوع کے لحاظ سے بالکل نئے ہیں۔ چند مضامین کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے جن میں اُردو زبان کی گنگا جمنی روایات اور ہندو دیو مالا اور اساطیر کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے۔

"ہندوستان کی برگزیدہ شخصیتوں میں ۲ وہ عظیم اور مقدس شخصیتیں جتنے دلوں پر

---

[1] ماہنامہ نیا دور لکھنؤ نومبر ص ۹۔ [2] پروفیسر منظر اعظمی اُردو میں تمثیل نگاری، ص ۱۳،

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

حکمران اور حقیقی نظروں کی رہنما ہیں۔ کم ہی ایسی ہستیاں ہوں گی۔ ایک میں جمال کا نور روشن تر تو دوسرے میں جلال کا جلوہ عکس فگن ایک اپنے اصولوں کا عاشق تو دوسرا خود عشق و معرفت کے اصولوں کا خالق۔ ایک کے ہاتھ میں تیر و کمان تو دوسرا مرلی بدست۔ شری رام چندر جی اور شری کرشن جی کا نام آتا ہے تو آنکھیں فرطِ ادب سے خود بخود جھک جاتی ہیں۔"

(اردو شاعری میں کرشن کی مرلی۔ ص ۱۲۲)

"سنسکرت کی قیمتی اور قدیم کتابوں کے فارسی میں منتقل ہونے سے اردو زبان کا ہندوستانی لب و لہجہ اور اس کی ہندوستانی فضا متاثر ہوئی۔ اس کے علاوہ مسلمان بادشاہوں کی مذہبی رواداری اور سیاسی بے تعصبی نے بھی آپسی تعلقات کو کافی متاثر کیا۔"

(اردو شاعری میں ہندوستانی لب و لہجہ ص ۳۶)

"میر کی شعری عظمت کے بارے میں دو رائیں نہیں۔ خود ان کے زمانے سے لے کر اب تک ان کے اندازِ سخن کی پیروی کی حسرت انگیز کوششیں کی جاتی رہیں۔ مگر اشعار میں زخموں کی وہ کسک اور نسیم صبح کی وہ مہک پیدا نہ ہو سکی جو میر کا خاصہ ہے۔"

(میر۔ ایک عظیم ہندوستانی شاعر، ص ۴۲)

اردو میں شعری زبان کی اصلاح کی کوششیں۔ ایک جائزہ۔ پروفیسر منظر اعظمی کی ایک اور باوقار کوشش ہے۔ یہ کتاب ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی اور شعری زبان کی اصلاح کے آغاز کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے۔

منظر اعظمی کو زبان پر قدرت حاصل ہے۔ وہ بڑے سلجھے ہوئے انداز میں بات کہنے کا گُر رکھتے ہیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی ادب پر بھی اعظمی صاحب دسترس رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے مضامین میں اردو اور ہندی کے ساتھ ساتھ فارسی کے منجھے ہوئے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ ان کی زبان ثقالت سے پاک ہے۔ وہ ضرورت کے مطابق تراکیب کا استعمال کرتے ہیں اور محاورات کا بھی۔ ان کے مضامین پڑھ کر بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

وہ بات کہنے میں کبھی تعصب سے کام نہیں لیتے ہیں بلکہ اپنے خیالات اور تجربات کو لوگوں کے سامنے رکھتے ہیں۔ اعظمی صاحب جذبات کی رو میں بہہ کر اپنے خیالات پیش کرنے کے عادی نہیں ہیں، وہ معاملے کی تہہ تک جاتے ہیں اور پھر سلجھی ہوئی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے روادار ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اعظمی صاحب حقیقی فن کار ہیں اور یہی کیا کم اہم ہے۔

٭ پروفیسر منظر اعظمی کی موجودگی میں جموں یونیورسٹی جموں کی ایک تقریب میں پڑھا گیا۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تبصرے

نیا آہنگ

اختر الایمان نے اپنے معاصرین شعرا پر قابل قدر اثر چھوڑا ہے ان سے پہلے میرا جی اور ن. م. راشد نے اپنے فنی رکھ رکھاؤ اور اسلوب بیان کی تازگی سے جدید نظم کی ارتقائی منزلوں کو چار چاند لگا دیئے لیکن اختر الایمان نے ان سے ایک قدم آگے جا کر اپنے شعور کی بالیدگی اور ذہن کی پختگی سے اردو کی جدید شاعری میں انقلاب پیدا کیا اور ہیئت و اسلوب کے لحاظ سے بالکل نئے تجربے کئے اور شعوری طور پر نظم کے تعمیر حسن کو فراوانی بخشی۔ اس بات کا انکشاف اس وقت ہوا جب 'بنت لمحات' کے نام سے ان کا مجموعۂ کلام منظر عام پر آگیا۔ اس مجموعۂ کلام سے پہلے 'گرداب' 'تاریک سیارہ' 'آب جو' 'یادیں' وغیرہ شائع ہو کر ادبی دنیا میں بحث کا موضوع بن چکے تھے۔ 'نیا آہنگ' ان کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔

اختر الایمان کا وطن یوپی ہے۔ یہیں ان کا بچپن گزرا۔ دلی کالج اور علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم پائی جہاں سے ترقی پسند شعرا کی ایک نمائندہ نسل سامنے آئی۔ مجاز، جاں نثار اختر، جذبی، سردار جعفری اور منیب الرحمٰن وغیرہ اسی دور میں شہرت کے آسمانوں کو چھونے لگے۔ اختر الایمان بھی انہیں لوگوں میں نمایاں طور پر نمودار ہوئے۔ ان کے ایک طرف یوپی کا نوابانہ ماحول تھا اور دوسری طرف دلی اور علی گڑھ جیسے بڑے شہروں کی تیز رفتار زندگی، ایک طرف مشینی دور کی توبہ شکن آوازیں اور دوسری طرف نچلے طبقے کے لوگوں کی افلاس زدہ کراہٹیں اور پھر ملک کے بٹوارے کا تلاطم۔ اس ماحول نے اختر الایمان کی شاعری اور ان کی شخصیت پر گہرے نقوش چھوڑے اور یہی دکھ درد غربت، افلاس سماجی پسماندگی، ہندوستانی معاشرت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کا غم وہ اپنی شاعری میں انڈیلتے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

ہے۔ 'نیا آہنگ' ایک بار پھر اسی کی روداد پیش کر رہی ہے جس کا اعتراف خود بھی اختر الایمان مجموعہ کے پیش لفظ میں یوں کرتے ہیں:۔

"میری شاعری کیا ہے؟ اگر ایک جملے میں کہنا چاہیں تو میں اسے انسان کی روح کا کرب کہوں گا۔ یہ کرب مختلف اوقات میں مختلف محرکات کے تحت الگ الگ لفظوں میں ظاہر ہوتا ہے"

'نیا آہنگ' میں شامل نظمیں اختر الایمان کے نئے تجربات، احساسات اور محسوسات سے بھرپور ہیں۔ اس میں سے چند نظمیں بہت پرانی ہیں اور مختلف اوقات پر مختلف جرائد میں چھپ چکی ہیں۔ 'اُمید' اور 'بیٹے نے کہا' یہ نظمیں رنگ و آہنگ اور موضوع اور ہیئت کے لحاظ سے کافی عرصہ پہلے کی معلوم ہوتی ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان دو نظموں کا حسن، رنگ اور دلکشی ماند پڑ گئی ہے بلکہ یہ بھی اپنی ایک الگ انفرادیت رکھتی ہیں۔ نظموں کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

ے تارے ماند پڑتے ہیں\
شب کے تیرہ آنگن میں\
چاند مسکراتا ہے\
نور کا فرستادہ\
برف کی طرح ٹھنڈا\
دیکھ کر یہ منظر میں\
سوچتا ہی رہتا ہوں\
اپنے جی میں کہتا ہوں\
میری صبح فردا بھی شاید ایسی روشن ہے ——— (اُمید)

ے بیٹے نے باپ سے پوچھا عجب انداز کے ساتھ\
پھر یہ کیوں ہے کہ اندھیرا ہے ہمارے گھر میں\
اور اس گھر میں ابھی تک بھی دیا جلتا ہے! ——— (بیٹے نے کہا)

'نیا آہنگ' کی بیشتر نظمیں علامتوں سے مالا مال ہیں۔ اختر الایمان نے علامتوں کا استعمال کر کے جدید نظم نگاری کو ایک اہم موڑ دیا ہے۔ یہ علامتیں اکثر پیکروں کی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

شکل اختیار کر کے انسان کو دور فضاؤں میں لے جاتی ہیں اور کبھی زبان و بیان کی کھردراہٹ میں مقید ہو کر قاری کو بار بار جھنجھوڑنے کا سامان بہم کرتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اختر الایمان کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ وہ پیچیدہ تجربات اور احساسات کو بیانیہ انداز میں پیش کرنے کے روا نہیں بلکہ علامتی اسلوب کی تخلیق کے ساتھ ساتھ تمام لوازمات کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ علامتوں کا بے جا استعمال زبان و بیان کا انفرادی رنگ، فنی رکھ رکھاؤ، تشبیہات و استعارات کا انوکھا استعمال اور اسلوب کا نرالا انداز ان تمام خصوصیات کا جائزہ "نیا آہنگ" پیش کرتا ہے۔ اس طرح سے ان کی نظموں میں نئے پیکر وجود میں آتے ہیں ــــ یہ بات قابلِ غور ہے کہ اختر نے نئے نئے موضوعات کا انتخاب کر کے اپنی نظموں کو نئی تیکنیک سے بالکل نیا اور جدید آہنگ بخش دیا ہے۔ زبان میٹھی رسیلی اور ساز و سوز سے چھلکتی ہوئی ملتی ہے۔ مثلاً،

؎ میرا پڑوسی بڑا پیارا آدمی تھا، اسے
گلی میں اُن کے آواز دی "غلام رسول"!
معاً مجھے یاد آیا میرا پیارا ہمسایہ
کبھی کا بن چکا بیچارہ اڑتے وقت کی دھول ــــ (پکنک)

؎ شہر سب ایک سے ہوتے ہیں کہیں
قحبہ خانے ہیں بہت اور کہیں رہنما
ڈھیرے سے بالوگ جرائم پیشہ
مختصر یہ ہے کہ بے چاری یہ اللہ کی زمین
اپنی گردش کے علاوہ بھی ہے مجبور بہت ــــ (قدرِ مشترک)

'نیا آہنگ' کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اُن کی نظموں میں کائنات کے مسائل، سماجی نابرابری، معاشی بدحالی اور زندگی کے اُتار چڑھاؤ ہر جگہ پر دکھائی دیتے ہیں۔ اختر کی نظموں میں احساس اور فکر کی ہم آہنگی براہِ راست پائی جاتی ہے۔ وہ انسان کی درد بھری آوازیں محسوس کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک زمین سے تا فلک تمام ذرّے ریزہ ریزہ ہو گئے ہیں۔ اُن کے نزدیک ایک انسان کو فقط دو وقت کی روٹی، سر چھپانے کو چھپر ــ اور ایک عورت! کی ہی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کو ماضی کے دھندلکوں سے نکل کر باہر کی فضاؤں میں بھی تیرنا ہے۔ وہ زمانہ بیت چکا ہے جب ایک انسان ذہنی، سماجی اور تعلیمی لحاظ سے بہت پست تھا۔ اس کو چاہیئے کہ وہ چار دیواری کے قیود سے نکل کر وقت کے دھارے کے ساتھ بہہ کر مقابلہ کرے۔ اپنی نظم 'آثار قدیمہ' میں انھوں نے اسی تاثر کا اظہار کیا۔ ملاحظہ کیجئے:

برتن، سکے، مہریں، بے نام خداؤں کے بت ٹوٹے پھوٹے
مٹی کے ڈھیروں میں پوشیدہ جکی چولھے
کُند اوزار زمینیں جن سے کھودی جاتی ہوں گی
کچھ ہتھیار جنھیں استعمال کیا کرتے ہوں گے مہک حیوانوں پر
کیا بس اتنا ہی ورثہ ہے میرا
انسان یہاں سے جب آگے بڑھتا ہے کیا مر جاتا ہے؟

'راہ فرار' اختر الایمان کی اہم نظم ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے وطن عزیز کی تاریخ کے مختلف ادوار کا محاکمہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ بدنصیب ملک تاریخ کے مختلف ادوار میں کس طرح ظالموں کی چیرہ دستیوں کا شکار رہا۔ یہ ملک بار بار لٹتا اور بار بار اس کی آبرو تار تار ہوئی۔ احمد شاہ ابدالی کا حملہ ہو یا نادر شاہ کا قتل عام انگریزی سامراج کی شاطرانہ چالیں ہوں یا ہندوستان کا بٹوارہ یہ سب باتیں ہماری میراث بن چکی ہیں۔ اختر کو اس میراث کو اپناتے سے عار نہیں کیونکہ یہ اس کے جسم و جان کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ 'راہ فرار' میں اختر الایمان نے حال اور مستقبل کے ایسے ہی مسائل کی چاپ سن لی ہے۔ وہ ایسی نسل کی ترجمانی کرتے ہیں جس میں ان مسائل سے نبرد آزما ہونے کی سکت نہیں۔ وہ ان تلخ واقعات اور مسائل کی تکرار کو نہ صرف اپنے لئے بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے سم قاتل سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کی آگہی ضروری ہے۔ اختر کی یہ نظم علامتی ہے۔ وہ دراصل ایک منفی انداز اختیار کر کے ان واقعات کی تلخیاں واضح کرتے ہیں۔ 'راہ فرار' اختیار کر کے اختر الایمان دراصل ان زخموں کے ٹانکوں کو کھول دیتے ہیں جو ان کے دل پر لگے ہیں اور وہ زخموں کے یہ پھول اپنی نسل کو پیش کرتے ہیں تاکہ ان میں بھی آگہی اور ادراک کا شعور پیدا ہو اور وہ ایک

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بہتر زندگی کی راہ تلاش کریں۔ یہ بند ملاحظہ ہو:۔

ع ادھر سے نہ جاؤ
کوئی راہ میں روک لے گا
نیا کوئی خطرہ نیا مسئلہ کوئی جس کا
نہ سوچا نہ سمجھا نہ احساس ہے جس کا اب تک
کوئی ایسی صورت نکالو
یہ سب آفتیں اپنا دامن نہ پکڑیں
کوئی اور راہ فرار ایسی ڈھونڈو
کہ ہم زندگی کے جہنم کو جنت سمجھ لیں!

اخترِ الایمان کے کلام میں خود کلامی کا رجحان بہ درجہ اُتم پایا جاتا ہے اکثر جگہوں پر وہ خود سے ہم کلام ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن میں خیالات، احساسات اور جذبات کو محسوس کرنے کا جو انوکھا انداز ملتا ہے۔ یہ اُن کے کلام کی ایک اور خصوصیت ہے۔ وہ ہنگاموں، جنگ، جدل اور خون ریزی سے کسی شخص، چیز یا معاملے پر قابو پانے کے عادی نہیں بلکہ محبت، خلوص اور شفقت سے حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں مثلاً:۔

ع اٹھاؤ ہاتھ کہ دستِ دعا بلند کریں
ہماری عمر کا ایک اور دن تمام ہوا
خدا کا شکر بجا لائیں آج کے دن بھی
نہ کوئی واقعہ گزرا نہ ایسا کام ہوا
زبان سے کلمۂ حق راست کچھ کہا جاتا
ضمیر جاگتا اور اپنا امتحان ہوتا —— (شیشے کا آدمی)

ع گر ہم کبھی پلٹ کے یہاں آئے اور اس
صحرا کی زندہ ریت نے بستی کو کھا لیا
سب اپنے جھنڈے ہر جگہ لہراتے پائیں گے
ہم ان کے نیچے پرکھوں کی قبریں بنائیں گے

(امد و ۱)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اختر الایمان نے مختصر نظموں کو فروغ دینے میں جو سرگرم حصہ لیا وہ اس میں بہت ہی کامیاب ہوئے۔ نیا آہنگ میں بھی چند نظمیں ایسی دیکھی جا سکتی ہیں۔ قدرِ مشترک، تادیب، نیا آہنگ، گریز، ایک کیفیت، لطیفہ وغیرہ قابلِ ذکر نظمیں ہیں۔ ان نظموں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اختر الایمان نے سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی ایک نئی مثال قائم کی ہے۔ اس کا پرتو آج کل کے بیشتر لکھنے والوں میں نظر آتا ہے۔ خورشید الاسلام، شہریار، محمد علوی، عادل منصوری وغیرہ کے ہاں اختر الایمان کی مختصر نظموں کے واضح اثرات دیکھنے میں آتے ہیں۔

'سب رنگ' کے عنوان سے نیا آہنگ میں اہم نظم ملتی ہے۔ یہ ایک منظوم ڈرامہ ہے جس میں مختلف کردار منظر کشی، وقت کا خیال، حاضرین، زمان و مکان کا تصور اور مکالمے بھی ہیں لیکن ڈرامے کے کردار حیوانات مقرر کئے گئے ہیں جنھوں نے اپنا اپنا رول بڑی خوبی اور دیانتداری سے نبھایا ہے۔ نظم 'سب رنگ' علامتوں سے مالا مال ہے۔ اور طنز و مزاح سے بھرپور بھی۔ اختر نے علامتوں کے ذریعے سے اپنی نظموں میں انگریزوں کے سفاکانہ اور ظالمانہ پن کو بے نقاب کر دیا ہے۔ یہ بات پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ ۱۹۴۷ء کا المیہ اختر کے لئے نا فراموش واقعہ ہے اور اس المیے کا گھاؤ اتنے برس گزرنے پر بھی ان کے دل میں تازہ ہے۔ یہ نظم ۱۹۴۳ء کی ہے اور ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آئی تھی۔ نظم کے ابتدائیہ میں اختر الایمان نے اپنے اسی ڈرامے سے قارئین کا تعارف کرایا ہے۔ انھوں نے اس منظوم ڈرامے کا مقام برِ اعظم ایشیا کا ایک جنگل رکھا ہے۔ تماشائی شجر و حجر، وقت اندھیرے اُجالے کے درمیان اور زمانہ ہمارا آپ کا رکھا ہے۔ 'سب رنگ' کا تعارف بہ ذاتِ خود چند علامتیں پیش کرتا ہے۔ اس نظم کو اختر الایمان نے کئی رنگوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے رنگ کا تعارف وہ یوں کراتے ہیں:-

"ابتدا میں ایسا تھا کہ لوگ الگ الگ گروہوں میں بٹے ہوئے نہیں تھے، ایک ہی قوم و جماعت تھے۔" (کتاب الحکمت)

دوسرے رنگ کا تعارف یوں ہو رہا ہے۔

"اچھے شوہروں کی رائے ہے کہ حسن عموماً بنجر زمین کی مانند ہوتا ہے۔ نہایت شاداب زمینوں میں کچھ بڑے بکرے بھی نکل آتے ہیں۔" (جان ڈف)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اس منظوم ڈرامے کا تیسرا رنگ یوں بیان کرتے ہیں:۔

"اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ گو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مگر فی الحقیقت مبتلائے شرک ہیں۔" (کتاب الحکمت)

آخر میں چوتھے رنگ کا تعارف یوں کراتے ہیں:۔

"مجھے کتوں نے گھیر لیا ہے۔ شیطنیت نے احاطہ کر لیا ہے۔ میرے ہاتھ اور پاؤں گھائل ہو گئے ہیں۔ میرے رفیق مجھے ان کتوں سے رہائی دلوا۔" (انجیل مقدس)

'نیا آہنگ' کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اختر الایمان عصر حاضر کے مسائل سے پوری طرح آشنا ہیں۔ ان کی شاعری پرانے اور دقیق خیالات کی ترجمان نہیں بلکہ ان کی شاعری میں زندگی کے نئے تجربات اور مشینی دور کی بے پناہ ترقی کا احساس ہوتا ہے۔ اختر الایمان کے زیر بحث مجموعہ میں عجیب کیفیت، گمشدگی، تڑپ اور گھلاوٹ ملتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ درد و غم احساس شدت، اظہار کی بے تکلفی اور ہندوستانی کلچر، تمدن اور تہذیب کا ایک خاص رچاؤ بھی ان کے کلام کا حاصل ہے۔ اس لحاظ سے اگر انہیں جدیدیت کے علمبرداروں میں ٹھہرایا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔

ماہنامہ سیارہ' لاہور
جلد ۵۴، شمارہ ۳-۴، مئی جون ۱۹۸۸ء
اشاعت خاص

دست چنار

بلبل کاشمیری لندن میں مقیم کشمیری نژاد شاعر ہیں۔ 'دست چنار' ان کا تازہ شعری مجموعہ ہے۔ اسے پہلے 'خندۂ گل' کے نام سے اُن کی مزاحیہ شاعری کا مجموعہ منظر عام پہ آچکا ہے اور اردو دنیا سے خراج حاصل کر چکا ہے۔ 'دست چنار' میں اُن کی سنجیدہ نظمیں شامل ہیں۔ یہ تمام نظمیں کشمیریات کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔

بلبل کاشمیری وادئی کشمیر کے ایک خوبصورت دیہات آجر (بانڈی پورہ) میں پیدا ہوئے کشمیر میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ کشمیر کے مختلف مقامات پر ملازمت

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کرتے رہے۔ دوسری جنگ عظیم میں وہ فوج میں بھرتی ہوئے اور مختلف محاذوں پر لڑتے رہے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آرمی سے وابستہ ہو گئے اور پاکستان کو ہی اپنا مستقبل مستقر بنا یا۔ اب گزشتہ تیس سال سے لندن میں مقیم ہیں اور شعر و ادب کی بے لوث خدمت کرتے ہیں۔

کشمیریات کے موضوع پر یوں تو متعدد شعرائے نے بڑی خوبصورت نظمیں لکھی ہیں اور اپنے انفرادی اور انوکھے ڈھنگ سے اس خطۂ ارضی کو خراج ادا کیا ہے لیکن کشمیر کے موضوع پر مسلسل مجموعے کی صورت میں بلبل کاشمیری کی کوشش مستحسن ہے۔ کشمیر کی خوبصورتی اور کشمیری باشندوں کے افلاس ناداری اور کشمیر کے تہذیب و تمدن کے بارے میں آج سے لگ بھگ چالیس سال قبل حبیب کیفوی (مرحوم) کا شعری مجموعہ آتش چنار ۱۹۵۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اُن کی نظموں میں بھی وطن سے ہجرت کا درد و کرب اور کشمیر سے اُن کا والہانہ عقیدت کا جذبہ کھل کر سامنے آتا ہے۔

کشمیر کے ایک شاعر پنڈت دینا ناتھ مست کاشمیری کا شعری مجموعہ فردوس خیال ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ یہ شعری مجموعہ بھی کشمیر سے متعلق نظموں پر مشتمل ہے۔ مست کاشمیری کا دعویٰ ہے کہ کشمیر کے مختلف موضوعات پر جتنی نظمیں انھوں نے کہی ہیں اتنی ریاست یا ریاست سے باہر کے ہی نہیں بلکہ دنیا کی کسی بھی زبان کے کسی بھی شاعر نے اتنی نظمیں نہیں کہی ہیں۔ یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے یہ ہماری بحث سے خارج ہے۔ البتہ فردوس خیال میں کشمیر سے متعلق مختلف النواع موضوعات پر نظمیں ملتی ہیں۔

بلبل کاشمیری کی نظموں کا مجموعہ دست چنار دیکھ کر مسرت ہو رہی ہے کہ انھوں نے طنز و مزاح کے علاوہ سنجیدہ شاعری کی طرف بھی توجہ کی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُن کے دل میں اپنے مادرِ وطن کشمیر کے لئے درد اور تڑپ ہے۔ معروف شاعر سید ضمیر جعفری "دست چنار" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"کشمیر کے موضوع پر ہمارے اہل قلم نے بہت کچھ لکھا ہے..... شعری حوالے سے کئی اعلیٰ درجے کی تخلیقات بھی اس خرمنِ ادب میں یقیناً موجود ہیں مگر مجموعی طور پر جس اخلاص جس تاثر جس رواتی اور توانائی کے ساتھ وادیٔ کشمیر کا درد بلبل کے لفظوں میں دھڑکتا سنائی دیتا ہے مٹی کا ایسا براہِ راست لمس

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

پورے عصری ادب میں کم دکھائی دے گا۔"

(دستِ چنار از بلبل کاشمیری، ص ۱۱)

'دستِ چنار' میں بلبل کی تئیس ۲۳ نظمیں شامل ہیں جن میں 'وطن میں آخری رات'، 'چناروں پر سلام'، 'اے وادی تجھ سے عہد میرا'، 'عارضِ کشمیر'، 'بانڈی پورہ'، 'پری محل'، 'تراگ بل' 'اسی وادی میں'، 'پہلگام'، 'او دیس سے آنے والے بتا'، 'لمحوں کا سفر'، 'خلد بریں'، 'مریم سے'، 'انتظار'، 'دعا' وغیرہ جیسی عمدہ نظمیں ہیں۔

جیسا کہ ذکر کر چکا ہوں کہ بلبل کاشمیری گزشتہ چالیس ۴۰ سال سے غیر ممالک کی خاک چھان رہے ہیں لیکن یہ بات باعث طمانیت ہے کہ انھیں اپنے مادرِ وطن کشمیر کی یاد برابر آتی رہتی ہے۔ وہ ڈل اور ولر جیسے صاف و شفاف پانی سے بھرے ہوئے خوبصورت جھیلوں شالیمار، نشاط، چشمہ شاہی اور اچھہ بل جیسے رنگ برنگے پھولوں سے لدے ہوئے باغات، گلمرگ لولاب اور پہلگام جیسے صحت افزا مقامات اور سوپور، بانڈی پورہ اور چترنار جیسی سیرگاہوں کو نہیں بھولے۔ اس کے علاوہ جب کبھی کبھی انہیں چنار، سفیدے، بادام اور صنوبر کے قطار در قطار درختوں کی سرسراہٹ محسوس ہوتی ہے تو ان کے دل کے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں اور اُن کے من کے اتھاہ ساگر سے بے شمار نغمے پھوٹنے لگتے ہیں کبھی کبھی وہ لندن میں بیٹھ کر زعفران کی خوشبو محسوس کرتے ہیں۔ انہیں بنفشی اور بادام کے جھنڈ دکھائی دے رہے ہیں وہ کبھی کبھی بے خیالی میں بانڈی پورہ پہنچ جاتے ہیں اور اُس مکان کی کھڑکی پر بیٹھ کر وہ برف کا نظارہ کرتے ہیں جہاں انھوں نے بچپن کے بے شمار لمحات گزارے ہیں۔ بلبل کی نظموں کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے جن میں تڑپ بھی ہے اور گداختگی بھی، بے قراری بھی ہے اور ملال بھی۔ مثلاً:

؎ چشمہ شاہی کی باد صبح گاہی پر درود
ملگجی شاموں میں گاتے شاخساروں پر سلام

؎ اچھہ بل یاد آگیا اور پایہ چھت یاد آگیا
تھام لو مجھ کو مجھے اپنا وطن یاد آگیا

؎ کوہساروں پر نظر آتے ہیں جو بادل مجھے
لگ رہے ہیں عارضِ کشمیر کے آنچل مجھے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہ منتظر ہیں ناز کی طاؤس چشتی سے رفیق
مضطرب ہے انجمن کی انجمن میرے لئے

دیکھئے اپنے دیہات بانڈی پورہ کی تصویر کس خوبصورتی سے کھینچتے ہیں:-

ہ وہ بانڈی پور جسے خود دستِ قدرت نے سنوارا ہے
وہ میرے پیار کا خط جو مجھ کو سب سے پیارا ہے
جو مسکن نازکی کا ہے جو حافظ کا بخارا ہے
میرے سینے پہ عمرِ رفتہ نے اک تیر مارا ہے
اسی وادی نے یادوں کے جزیروں میں پکارا ہے

کشمیر کے دور افتادہ پہاڑی مقام پہلگام کے بارے میں بلبل کے خیالات داد دینے کے لائق ہیں، کہتے ہیں:-

دخترِ دوشیزۂ کوہِ ہمالہ پہلگام — کھل گئے ہیں آسمانوں کے دریچے تیرے نام
سجتی ہے قامت پہ یہ رنگین قبائے سبز فام
اور سجی ہاتھوں میں یہ چھلکا ہوا فطرت کا جام

دستِ حنا اپنے موضوع کے لحاظ سے بلبل کاشمیری کا قابلِ قدر مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ کشمیر اکیڈمی مظفر آباد کے زیرِ اہتمام شائع ہوا ہے۔ اس کا تعارف ڈائرکٹر کشمیر اکیڈمی جناب جواد جعفری نے لکھا ہے۔ ۹۷ صفحات پر مشتمل اس شعری مجموعے میں کشمیر کی رنگارنگ اور خوشنما تصویر نگاہوں کے سامنے آتی ہے۔ افسوس ہے کہ اکیڈمی نے اس مجموعے کو شائع کرنے پر زیادہ توجہ نہیں دی ہے۔ اس طرح سے کتابت اور طباعت کی کمزوریاں جگہ جگہ پائی جاتی ہیں۔ کتاب کا ٹائیٹل اگرچہ معنی خیز ہے لیکن کور معمولی کارڈ کا ہے جو اس خوبصورت شعری مجموعے کے شایانِ شان نہیں۔

(ماہنامہ "شیرازہ" سری نگر
جلد ۳۵- شمارہ ۱۰-۹

گر یہاں جھوٹ بولنا ہے

اردو کے معروف کہانی کار رہبر جرن چاولہ کا ان کی کہانیوں کا مجموعہ ہے ... ہے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اُن کے سات افسانوی مجموعے شایع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ چاولہ کے تین ناول بھی چھپ چکے ہیں۔ اور اپنی یادوں پر مشتمل اُن کی خودنوشت سوانح البم کے نام سے آج سے چھ سال قبل منظرِ عام پر آ چکی ہے۔ اس طرح سے وہ بحیثیت ناول نگار، افسانہ نگار اور سوانح نگار کے یکساں قدرت رکھتے ہیں لیکن افسانہ نگاری میں انہیں خاصی قدرت حاصل ہے

ہرچرن چاولہ تین دہائیوں سے مسلسل لکھ رہے ہیں۔ اُن کے افسانے ملک اور بیرونِ مُلک نمائندہ رسائل و جرائد میں شایع ہو کر پسند کئے جا رہے ہیں۔ وہ اپنے مخصوص انداز اور منفرد ڈکشن کی وجہ سے نئے افسانوی سفر میں پیش پیش ہیں۔

سالِ رواں کے دوران لاہور سے شایع ہونے والی کہانیوں کے مجموعے ڈھائی اکھر کے بعد گڑیاں جھوٹ بولتا ہے ہرچرن چاولہ کی کہانیوں کا تازہ مجموعہ اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس میں اُن کی تقریباً بیس کہانیاں اور گیارہ منی کہانیاں شامل ہیں جن میں گڑیاں جھوٹ بولتا ہے، قفس، بیوی اور بیماری، پسِ دیوار، ساتیوں کا جوڑا، دریا اور کنارے، انگارہ، ڈھائی اکھر، زخموں کے سوداگر اور منی کہانیوں میں مکتی، تھر، عورت، دیرہ، نتیجہ، کبیرا نہ سا کبھی اور دریا کبھی وغیرہ نمائندہ حیثیت رکھتی ہیں۔

چاولہ کے ان افسانوں کا موضوع خاص زندگی کی حقیقی تصویر کشی ہے وہ جھوٹ اور کذب و افترا سے نفرت کرتے ہیں۔ اُن کی نگاہیں نہ صرف انسان کے بے فکر لمحات پر ہی رہتی ہیں بلکہ وہ اُس کے اندر جھانکنے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور ساری انانیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ انسان کے مسائل، اُن کا درد و کرب اور اُن کے مصائب و مشکلات کا چاولہ کو بخوبی اندازہ ہے۔ اُن کی کہانی آج کل کے ٹوٹتے اور بکھرتے ہوئے انسان کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ اُن کا مشاہدہ تیز اور مطالعہ وسیع ہے۔ چاولہ سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتے بلکہ معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے قائل ہیں۔ اُن کے کردار چلتے پھرتے کردار ہیں، یہ کردار ایسے سچے اور کھرے ہیں کہ حقیقت پسندی کا دامن نہیں چھوڑتے۔

ہرچرن چاولہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ اُردو کی بستی سے دُور سرزمین ناروے میں برس ہا برس سے اقامت پذیر ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اُردو سے محبت کرتے ہیں اور ہندوستان کی تہذیب، ثقافت اور کلچر کی اپنے افسانوں میں پوری عکاسی کرتے ہیں اور یہ ان میں ایک خاص بات پائی جاتی ہے۔ جناب ہر

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

نے گریبان جھوٹ بولتا ہے پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ

" ہرچرن چاولہ کے فکری رویے ملکوں اور قوموں کی حد بندیوں سے بے نیاز ہیں۔ وہ صرف انسانی قدروں کے علمبردار نظر آتے ہیں "

'گریبان جھوٹ بولتا ہے' ادارہ فکر جدید، نئی دہلی نے بڑے اہتمام کے ساتھ شایع کی ہے۔ اعلیٰ کتابت، عمدہ کاغذ اور نفیس طباعت سے یہ مجموعہ مالامال ہے۔ قیمت صرف ڈیڑھ سو روپے ہیں جو بالکل مناسب ہے۔

مفتاحِ اقبال

عبداللہ خاور ایک باصلاحیت اشاریہ نگار ہیں۔ اُردو ادب سے متعلق اُن کے اب تک کئی اشاریے مختلف معیاری رسائل میں شایع ہو چکے ہیں۔ وہ مفتاحِ اقبال کے عنوان سے حال ہی میں علامہ اقبال کی شخصیت اور اُن کے فن سے متعلق مضامین کا موضوعاتی اشاریہ مرتب کر چکے ہیں جو اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی نے بڑے اہتمام کے ساتھ کتابی صورت میں شایع کیا ہے۔

موضوعاتی اشاریہ مرتب کرنا ایک فن ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی تحقیق کو ایک مستند صحیفہ قرار دیتے ہیں۔ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ایک جگہ پر لکھتے ہیں:

" اشاریہ نمبر کی اپنی افادیت ہے۔ تحقیق کے اعتبار سے یہ ایک مستند صحیفہ ہے۔ عام قاری کے لئے اس کی اہمیت نہ ہو لیکن وہ جو تاریخوں میں ٹٹول ٹٹول کر چلتے ہیں تاکہ علم کے دفینے کھوج نکالیں وہی اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں"[1]

شاعری افسانے اور مختلف موضوعات پر مضامین یوں تو آئے دن رسائل و اخبارات میں کثرت سے شایع ہوتے رہتے ہیں لیکن اشاریہ سازی کی طرف بہت کم لوگ توجہ دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے اقبال اکادمی پاکستان کی کوششیں قابلِ ستائش ہیں

[1] ماہنامہ سیارہ لاہور، ص ۴۷۵، اشاعت خاص ۲۷ سالنامہ ۱۹۸۹ء جلد ۵۵ شمارہ ۵۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

جو ہر سال اقبال سے متعلق شایع شدہ مضامین کی فہرست شایع کرتی رہتی ہے لیکن
چونکہ اکادمی کا دائرۂ عمل فقط علامہ اقبال تک ہی محدود ہے اس لئے جو لوگ اُردو ادب
کے دوسرے موضوعات پر کام کرتے ہیں وہ ضرور کئی دشواریاں محسوس کرتے ہوں گے۔
حالانکہ میر، انیس، شبلی، مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، مولانا آزاد، عبدالودود،
فیض اور آل احمد سرور وغیرہ جیسے شاعروں اور دانشوروں کی شایع شدہ تحریروں پر
مختلف رسائل و جرائد میں موضوعاتی اشاریئے چھپ چکے ہیں لیکن یہ امتیاز بہت کم
لوگوں کو حاصل ہے جن کی تحریروں کے اشاریئے مرتب ہو کر کتابی صورت میں شایع ہو چکے
ہیں۔ ان لوگوں میں غالب، اقبال، انیس اور فیض کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

عبداللہ خاور اس وقت اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی میں لائبریرین کے
فرائض انجام دے رہے ہیں۔ یہ بات باعث طمانیت ہے کہ انہیں پروفیسر آل احمد سرور،
پروفیسر عالم خوندمیری اور پروفیسر مسعود حسین خان جیسے عالموں اور فاضلوں کی سرپرستی
میں کام کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ ان اہل اقلیم سے انہیں عام طور پر ادب سے متعلق اور
خاص طور پر علامہ اقبال سے متعلق بہت کچھ سیکھنے اور جاننے کا موقعہ ملا ہے۔ اس کے
علاوہ اقبال انسٹی ٹیوٹ میں آئے دن منعقد کئے گئے سمیناروں اور ادبی تقاریب سے
بھی اُن کا ذہن کشادہ ہو گیا۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ میں اقبال سے متعلق نادر کتابوں،
خاص نمبروں اور نایاب رسائل و جرائد کے گوہر نایاب سے بھی عبداللہ فیض اٹھا چکے ہیں۔
عبداللہ خاور اردو ادب سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ تحقیق و تنقید کی طرف اُن کا رجحان
ابتدا سے ہی تھا۔ کالج کے دنوں میں بہت اچھے مضامین لکھ چکے ہیں۔ چنانچہ تعلیم مکمل کرنے
کے بعد جب انہیں لائبریری میں کام کرنے کا موقعہ ملا تو اُن کے اس شوق کو ہوا لگ گئی اور
وہ سنجیدگی سے ادب کے مختلف موضوعات پر سوچنے لگے۔ انھوں نے اشاریئے مرتب کرنا اپنی جولاں
گاہ کیوں بنائی؟ اس کے بارے میں انھوں نے کتاب میں کہیں ذکر نہیں کیا۔ وہ اس کو زہرہ گداز مہم
قرار دیتے ہیں جس کو سر کرنے کی انھوں نے پوری پوری کوشش کی البتہ اقبالیات کے گہرے
مطالعے اور انسٹی ٹیوٹ کے اسکالروں کی مشکلات کو مدِنظر رکھتے ہوئے وہ اشاریئے مرتب کرنے
کی طرف راغب ہوئے اور اب تک کئی اشاریئے مرتب کر چکے ہیں۔

مفتاحِ اقبال ریسرچ اسکالروں خاص طور پر اقبال پر کام کرنے والوں کے لئے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ایک صحیفے سے کم نہیں۔ اس میں اقبال کی شخصیت اور فن کے گوناگوں موضوعات پر اشاریے ملتے ہیں۔ عبداللہ خاور نے اقبال سے متعلق جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے اُن کی تفصیل یوں ہے:۔ اجتہاد، اسلوب، اماکن، انسانیت، تاثرات، تبصرے اور جائزے، تصورِ ابلیس، تصورِ خودی، تصورِ زمان و مکان، تصوف، تعلیم، تنقید و تحقیق، خطبات، خطوط، سماجیات، سوانح، سیاست، شعری محاسن، عشقِ رسول، عہد، غزل، فکر و فن، فن، فلسفہ، قرآن، مذہب، مردِ مومن، مسجدِ قرطبہ، مشاہیر، مغرب، نظم، نوجوان، متفرقات وغیرہ اگرچہ یہ موضوعات اقبالیات کا پورا احاطہ نہیں کرتے لیکن عبداللہ خاور کی کوششوں سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا جن رسائل و جرائد تک اُن کی رسائی ہوئی۔ انھوں نے پوری دیانتداری سے ان کی نشاندہی کی اور اس طرح سے ایک ایماندار لائبریرین اور اشاریہ نگار کا فرض نبھایا ہے۔ خاور نے نہ صرف ماہناموں اور خاص نمبرات کو زیرِ نظر رکھا بلکہ ہند و پاک میں شائع ہونے والے روزناموں اور ہفتہ وار اخبارات کو بھی ملحوظِ نظر رکھا نیز اقبال کے فکر و فن پر ترتیب دی گئی کتب اور مختلف اداروں اور یونیورسٹیوں کی تقریبات میں پڑھے گئے پرچوں کا انتخاب کر کے کتابی صورت میں شائع ہونے والی کتابوں کو بھی خاور نے بڑے سلیقے سے ترتیب دے کر مفتاحِ اقبال میں شامل کیا ہے۔ عبداللہ خاور نے شاعر بمبئی، صحیفہ لاہور، سب رس حیدرآباد، شیرازہ سرینگر، نقوش لاہور، نیرنگِ خیال لاہور، جوہر دہلی، فنون لاہور، تحریک دہلی، الحمرا لاہور، اردو دہلی، شاداب حیدرآباد، رسالہ اردو دہلی، علیگڑھ میگزین علی گڑھ وغیرہ جیسے مقتدر رسائل و جرائد کے خاص نمبرات کا بغور جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے اقبال سے متعلق شائع ہونے والی کتابوں میں سے مختلف موضوعات کے تحت مضامین کے اندراجات بھی ریسرچ اسکالروں کی سہولیات کے لئے مفتاحِ اقبال میں شامل کئے ہیں۔

مفتاحِ اقبال اقبال سے متعلق اطلاعات سے مالامال ہے۔ اقبال سے متعلق بعض موضوعات ایسے ہیں جن پر کثرت سے لکھا گیا ہے۔ ان کو عبداللہ خاور نے بڑی خوبی کے ساتھ اشاریئے میں شامل کیا ہے۔ چونکہ موضوعات حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیئے گئے ہیں۔ اس لئے قارئین کو دقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ کتاب کا گٹ اپ دیدہ زیب ہے۔ کتابت و طباعت کے لحاظ سے بھی یہ کتاب خوبصورت ہے۔ سرورق معنی خیز اور قیمت مناسب ہے۔

(ماہنامہ "شیرازہ" سری نگر)

جلد ۳۵۔ شمارہ ۱۰۔ ۹۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

رشکِ قمر

قمر جلال آبادی فلمی دُنیا کے ایک مشہور و معروف شاعر اور نغمہ نگار ہیں۔ اُن کے گیتوں میں جہاں ایک طرف سوز و گداز اور کیف و سرمستی ہے وہاں دوسری طرف درد و کسک کی ہلکی ہلکی آنچ بھی ملتی ہے۔ قمر کی آواز دُور سے پہچانی جاتی ہے اور اس کا زیر و بم بڑی دیر تک کانوں میں گونجتا ہے۔ قمر کے گیتوں اور نغموں سے رس اور لوچ ٹپکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے جذبات اظہار کرنے پر قادر ہیں۔ مشہور شاعر قتیل شفائی ایک جگہ پر قمر جلال آبادی کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"قمر ایک فرد نہیں بلکہ ایک انسٹی ٹیوشن ہیں۔ آپ نے اپنے اردو ہفتہ وار 'استاد' لاہور میں میری، رضا ہمدانی، فارغ بخاری، ابن انشا اور افسانہ نگار رام لال کی اوّلین تخلیقات شایع کر کے ہمیں ادبی دُنیا سے متعارف کرایا۔"[1]

رشکِ قمر، قمر جلال آبادی کا اوّلین شعری مجموعہ ہے۔ اس میں اُن کی ٦٧ غزلیں شامل ہیں۔ اس کا پیش لفظ جناب کالی داس گپتا رضا نے لکھا ہے اور کسی نامعلوم شخص نے قمر جلال آبادی مختصر سوانح حیات کے عنوان سے قمر صاحب کی زندگی کا مختصر سا خاکہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد غزلوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ قمر کی غزلوں میں جہاں ایک طرف روایت کی پاسداری ملتی ہے وہاں دوسری طرف جدیدیت کی رنگ آمیزی بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن وہ ایسی جدیدیت کے خلاف ہیں جو بے معنی ہے۔ قمر جلال آبادی نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی لکھی ہیں اور قطعات اور رباعیات بھی لیکن اُن کی غزلیں اُن کی جودتِ طبع کی غماز ہیں۔ قمر علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان اور تاجور نجیب آبادی سے بے حد متاثر ہیں۔ اُن کی غزلوں میں جوش، جگر، احسان دانش اور حفیظ جالندھری کا رنگ بخوبی پہچانا جا سکتا ہے لیکن اس رنگ کے ساتھ ہی ساتھ اُن کا ایک الگ اور انفرادی رنگ بھی ہے۔ قمر کی شاعری میں تغزل، نغمگی اور مٹھاس کی کمی نہیں۔ یہ نغمگی اور موسیقیت اُن کی غزلوں میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں درد بھی ہے اور کسک بھی نغمگی

[1] فلمی دنیا کے ساتھ وابستہ ہونے سے قبل قمر صاحب ہفتہ وار 'استاد' لاہور کے ساتھ وابستہ تھے۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بھی ہے اور سرور و کیف بھی۔ مثلاً :-

؎ ساری دُنیا میں اسے ڈھونڈ کے گھر لوٹے ہیں
اور آنگن ہی میں وہ جلوہ کناں ہے یارو

؎ ہم نے پالا ہے اسے خونِ جگر کا دے کر
ہم سے پوچھا کرو تم زخمِ جگر کی باتیں

؎ عشق کیا ہے مجھے کیا علم یہی سمجھا ہوں
اک فسانہ ہے جو آنکھوں سے بیاں ہوتا ہے

؎ آسماں پر مہہِ نو کا یہ چمکتا یوں دن
یا کسی شوخ کی ٹوٹی ہوئی انگڑائی ہے

؎ دیکھ مت سوئے فلک اونچے مکانوں کی طرح
سج کے بیٹھے ہیں تیری رہ میں دکانوں کی طرح

قمر کی غزلوں کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ہاں غمِ دوراں اور غمِ جاناں کی کارفرمائی ملتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ابتدا سے ہی عشق کے معاملے میں ٹھیس کھائی ہے اور زندگی کے بہترین لمحات عشق کے خارزار میں گزارے ہیں۔ اسی لئے اُن کی غزلوں میں محبوب کی بے اعتنائی ہر جگہ دیکھنے میں آتی ہے۔ خاص طور پر رتنسک قمر کی غزلوں میں وہ جذبۂ عشق کے متعلق اپنے خیالات واضح طور پر بیان کرتے ہیں۔ وہ کبھی حضرت یوسفؑ کی طرح مصر کے بازاروں میں بک جاتے ہیں اور کبھی محبت کے لئے اپنی جھولی پھیلا دیتے ہیں۔ کبھی وہ محبوب کا تعاقب کرتے کرتے صحراؤں کی خاک چھانتے ہیں اور کبھی اپنی جان کی بازی لگا کر بھی وہ محبوب کو پانے میں ناکام رہتے ہیں۔ مثلاً :-

؎ یوسف جیسے بک جاتے ہیں ہم جیسوں کی گنتی کیا
پوچھیں گے بازار میں ہم بھی جنسِ ہنر کے بارے میں

؎ جھولی پھیلا چکے محبت کی — کوئی داتا نظر نہیں آتا

؎ تب میرے دل کے حال کو تم جان پاؤ گے
اے کاش تم کو بھی ہو محبت کسی کے ساتھ

؎ عشق میں تو جو لُٹ گیا حسن سے تجھ کو ہے گلہ

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

عشق کہاں گلہ کہاں ذکر یہ دم بدم نہ کر

ء نگہ نگہ سے ملی دل سے دل ملا نہ سکا
میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ تجھ کو پا نہ سکا

رشک قمر میں مختصر ترین بحور میں بھی چند غزلیں نظر سے گزرتی ہیں۔ یہ غزلیں بھی اپنے اندر گہری معنویت رکھتی ہیں۔ ان میں جگہ جگہ خوبصورت تشبیہات و استعارات کے ساتھ ساتھ نئی اور تازہ علامتیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ اکثر جگہوں پر خیالات اور تجربات نئے سانچوں میں ڈھلے ہوئے ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں سلاست اور روانی بھی ہے اور معنی آفرینی بھی، برجستگی بھی اور کیف و سرمستی بھی۔ کہتے ہیں:

ء روتے ساون میں تم سے بچھڑے تھے — عمر بھر ایک ہی مہینا ہے
ء آنکھ سے گر پڑے تو اشک ہے وہ — اور رک جائے تو نگینا ہے
ء یہی ہے جہانِ وفا کی کہانی — تجھے پا لیا اور کھو دی جوانی
ء عشق کے راج میں جو نکلے تھے — ہیرے پتھر سے سستے دیکھے

رشک قمر کی غزلوں میں اگرچہ روایتی تراکیب ملتی ہیں جن میں اقبال، جوش، احسان دانش اور حفیظ کی استعمال شدہ تراکیب کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے مثلاً شامِ فرقت، دردِ آرزو، حصولِ کائنات، آبِ بقا، کشتِ دل، رشکِ قمر، نگہِ ناز، عاشقِ صادق، روزِ قیامت، ترکِ محبت، رہِ وفا، منزلِ عشق، انتظارِ سحر، وغیرہ۔ لیکن قمر نے ان تراکیب کو کہیں کہیں نئے انداز میں استعمال کر کے اپنے اشعار میں معنی آفرینی پیدا کر دی ہے۔ قمر کی غزلوں میں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے الفاظ بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ ان الفاظ میں مکتی، دیوتا، لیون، میگھ، ساگر، روپ، سیج، ساون، ندی، گھٹا، لاج، صرف چند خوبصورت، نرم اور ملائم الفاظ ہیں جن کو انھوں نے اپنی غزلوں میں براہِ راست جگہ دی ہے۔ اس طرح سے ان کی غزلوں میں وقار اور وزن پیدا ہو گیا ہے۔
رشک قمر کا گٹ اپ دیدہ زیب اور کاغذ اچھا ہے۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

فکروفن

اکبر جے پوری وادیٔ کشمیر کے ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ وہ کافی عرصہ سے شاعری میں اپنے دل کا دور انڈیلتے آئے ہیں۔ اور غزل، نظم، مثنوی، قطعہ، رباعی، سلام وغیرہ مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اکبر جے پوری کے دو شعری مجموعے سازِ شکستہ اور فکرِ خیال اب تک منظر عام پر آچکے ہیں اور اب فکروفن کے عنوان سے وہ اپنا ایک اور شعری مجموعہ پیش کرتے ہیں۔ یہ مجموعہ آل انڈیا ہندی اردو سنگم لکھنؤ کے زیر اہتمام شایع ہوا ہے۔ ۱۶۸ صفحات پر مشتمل زیر بحث مجموعے میں ۷۷ غزلیں شامل ہیں۔ مجموعے کے آغاز میں جناب حیات وارثی اور خواجہ وجیہہ الدین نے اکبر کی شخصیت اور ان کی غزل گوئی پر روشنی ڈالی ہے۔

فکروفن کی غزلیں اکبر کے سابقہ مجموعوں کی غزلوں کے مقابلے میں زیادہ جاندار ہیں۔ ان میں ایک خاص قسم کا توازن اور وقار پایا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اکبر ایک رومانی شاعر ہیں۔ عشق و رومان کی کشش ابتدا سے ہی ان کے کلام میں پائی جاتی ہے اور وقت گزرنے کے بعد بھی اس کی تمازت کم نہیں ہونے پائی۔ عشق دراصل ان کے ہاں ایک علامت کا روپ اختیار کر چکا ہے۔ اگرچہ یہاں بھی وہی ہجر کا ملال، محبوب کا وصل اور عہد و پیماں کی جھلک ان نگاہوں کے سامنے آجاتی ہیں لیکن اکبر نے زبان و بیان کی خوبصورتی سے ان غزلوں میں نیا رنگ بھر دیا ہے۔ اکبر عشق کے ساتھ ساتھ حسن کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ اس طرح سے جب عشق اور حسن کا سنگم ہوتا ہے تو ان پر عجیب دیوانگی طاری ہو جاتی ہے اور تڑپ کر کہہ اٹھتے ہیں:

؎ بازارِ محبت کی ہر رسم نرالی ہے — جھنجر میں گراں جتنے سر اتنے ہی سستے ہیں

؎ حسن تم کو پسند عشق مجھے — اپنی اپنی نگاہ ہوتی ہے

؎ ہمارا ذکر کبھی ہوگا یقیں ہے اکبر — لکھیں گے اہل قلم جب بھی عشق کی روداد

؎ ہے مکان و زماں سے عشق آزاد — حسن کی جلوہ گاہ ہوتی ہے

اکبر جے پوری کی غزلوں میں موجودہ دور کے انسان کا درد و کرب بھی اپنی ہمہ گیر حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود اس درد و کرب میں گرفتار رہے۔ زمانے نے ان پر کتنے ہی ظلم ڈھائے ہیں۔ لیکن اس سے بڑھ کر خودداری کی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ انھوں نے ان مظالم کا ہنستے ہنستے مقابلہ کیا ہے اور ان سے جو

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تجربات حاصل کئے ہیں اُن کو اپنی غزلوں میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے فرماتے ہیں :۔

؎ ظلم و ستم کی داستان میری حیات جاوداں
میری نوائے دل شکن پھیلی ہے کائنات میں

ایک اور جگہ پر اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :۔

؎ پوچھتے کیا ہو حال اکبرؔ کا — کیا کہیں دکھ بھرا فسانہ ہے

اس پس منظر میں چند اور شعر پیش خدمت ہیں :۔

؎ ازل میں کس کو خبر تھی یہ ہونے والا ہے
کہ جو بناتے ہیں ہم کو وہی مٹا دیں گے

؎ بے کسی پر میری اب تجھ کو بھی رحم آتا نہیں
اے اجل کیا تو بھی لذت آشنائے درد ہے

؎ پوچھنے آئے ہیں اب وہ مجھ سے میرا حال زار
جب نظام عالم ہستی بدل کر رہ گیا

اکبرؔ جے پوری کی غزلوں میں حیات و کائنات کا حسین امتزاج بھی اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان غزلوں میں غم روزگار کے مسائل سیاسی اور معاشی آشوب کی جھلکیاں اور موجودہ دور کے انسان کی بے چینی اور درد و کرب کا احساس جگہ جگہ ابھرتا ہے۔ اکبرؔ اپنے مادر وطن کشمیر سے والہانہ عشق رکھتے ہیں۔ اس کا ذکر وہ اپنے اشعار میں بار بار کرتے ہیں۔ وہ اپنی غزلوں میں اس کے کلچر تہذیب تمدن اور اس کے صحت مند اقدار کی بھر پور عکاسی کرتے ہیں مثلاً:

؎ ہے دعا اے جنت کشمیر یہ تیرے لئے
تا ابد روشن رہے نیر تیری تقدیر کا

فکر و فن اکبرؔ جے پوری کی ایک منجھی ہوئی اور کامیاب کوشش ہے۔ کاغذ اور طباعت کے اعتبار سے یہ مجموعہ قابل قدر ہے ؂

○

اجنبی ہوا شباب للت اردو کے ایک پختہ مشق شاعر ہیں۔ اُن کے اب

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تک ایک درجن کے قریب شعری مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ "اجنبی ہوا" ان کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ اس میں اُن کی ۴۳ نظمیں، ۳۱ غزلیں، ۲۲ رباعیات، ۱۰ قطعات اور دوہے وغیرہ شامل ہیں جو رنگا رنگ موضوعات پر مبنی ہیں۔

شباب کی شاعری میں ہماچل کے مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ اس میں جہاں ایک طرف فکر و نظر کی بالیدگی پائی جاتی ہے وہاں دوسری طرف کیف و سرمستی اور تازگی و توانائی بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ شباب ایک حساس فنکار ہیں۔ انھوں نے شاعری کی مختلف اصناف میں اپنے دل کا درد کاغذ پر انڈیلا ہے۔ جہاں تک اجنبی ہوا کا تعلق ہے اس میں ایک انسان کے درد و کرب اُس کی الجھنوں اور پریشانیوں کا کھل کر اظہار کیا گیا ہے۔ شاعر نے اس شعری مجموعے کا آغاز نظموں سے کیا ہے۔

ان نظموں سے شاعر کی دیدہ دلیری کا پتہ چلتا ہے۔ یہ نظمیں شباب کے گہرے مطالعے اور مشاہدے کی غماز ہیں اور جداگانہ کیفیت رکھتی ہیں۔ ان نظموں میں تمنا آخری ہے، مبارک وہ دشت ہے، اپنے مرکز کی طرف، لمحۂ وصال، بھرم، تعلیم زدہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ "نکتہ راز" شباب کی ایک عمدہ نظم ہے۔ اس میں وہ تسخیر کائنات کا عزم کرتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ انہیں نقطۂ آغاز کا بھی احساس ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو لوگ بلندی پر چلے جانے کے خواہاں ہیں انھیں پستی کا خیال بھی رکھنا چاہیئے۔ اُن کا خیال ہے کہ انسان کو اپنی جڑوں سے رشتہ ہرگز نہیں توڑنا چاہیئے بلکہ اُن کی جڑیں ان کے وجود کا سرچشمہ ہوتی ہیں۔ نظم علامتی ہے اور پڑھنے والے پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ "شمشیر و سناں اول" پڑھنے سے بھی کچھ ایسا ہی ردِعمل قاری کے دل و دماغ پر طاری ہوتا ہے۔ اس نظم میں بھی انسان کا درد یہاں وہاں موہوم صورت میں دیکھنے میں آتا ہے۔ شباب کی نظم بھرم بھی ایک اچھی کوشش ہے۔ اس میں خود کلامی کا عمل دخل ہے۔ یہاں بھی ذات کے کرب کا احساس ہوتا ہے۔

شباب کی نظمیں پیش کش، حسن، کفایت شعار، ہم ناچیز بندے اور منافق وغیرہ بڑی عمدہ اور جاندار نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں بھی احساس کی گرمی شدت سے محسوس کی جاسکتی ہے۔

خواتین کے لئے شباب کی نظمیں بھی غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔ ان نظموں میں

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

رحمتِ حق بیٹیاں، ہاتھی کے دانت، حسن کی کفایت شعار، تعلیم زدہ، وغیرہ قابل ذکر ہیں شباب نے عورت کے مسائل، اُن کی تعلیم، اُن کے صبر و ایثار اور اُن کے بعض دیگر مسائل کا نقشہ اپنے انوکھے انداز سے کھینچا ہے۔ اِن نظموں میں اُن کا طنزیہ لب و لہجہ بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ نظموں کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

ہاں بڑے چاؤ سے
اشتیاق و تمنا کے طوفان بھرے
جوش و ارمان بھرے
چاہتوں سے چھلکتے دلوں نے
خواتین کے سال کا خیر مقدم کیا تھا
مبارک سلامت کے سیل نوا میں
واقعی کیا خوش اقبال تھا
ماشاءاللہ

(ہاتھی کے دانت)

ہم نے دیکھا یہ ہمیشہ کرو ہی لوگ شباب
جن کی ہوتی ہیں وفاداریاں اپنی مشکوک
اپنے باطن کی خباثت کو
چھپانے کے لئے
اُنگلیاں اپنی اُٹھاتے ہیں وفاداروں پر
اہلِ اخلاص و وفا سے
یہی ہوتا ہے سلوک

(منافق)

شوہر کی آستیں پہ بٹن ٹانکنا تو دور
ترکاری کاٹنے کا بھی سیکھا نہیں شعور
سمجھے نہ خانہ داری کے اُس نے اگر امور
ماں باپ کا نہیں تو یہ کس کا ہے پھر قصور
تعلیم [illegible] جس میں [illegible] ہاتھ [illegible] ہو

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

جس سے مٹے نہ تیرگی کس کام کا وہ نور

—— (تعلیم زدہ)

شباب للت غزل میں بھی اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں بھی اس دور کا آشوب پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ شباب غزل کہنے کا ایک الگ اور انفرادی انداز رکھتے ہیں۔ اُن کی غزلوں میں داخلی کیفیات اور واردات عشق کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اُن کا لہجہ نرم اور شگفتہ ہے۔ شباب کی غزلوں میں چند عمدہ اور قابل قدر علائم بھی ملتی ہیں۔ تراکیب کی جدت اور تشبیہات و استعارات کے انوکھے پن نے اُن کی غزلوں میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ روائت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ شباب کی غزلوں میں نیا رنگ اور آہنگ ملتا ہے۔ ان میں بھی موجودہ دور کے انسان کا درد و کرب اور اس کی بے راہ روی ملتی ہے۔ مثلاً کہتے ہیں:۔

ے ماں کی ممتا، باپ کی شفقت کا رکھیں کچھ لحاظ
آج کے لخت جگر، نور نظر، دشوار ہے

ے میں وہ صحرا ہوں جسے پورا سمندر چاہئے
چند قطروں سے بجھاؤ گے مری تم پیاس کیا

ے کئی صدیوں سے ہم شہری ہیں لیکن   لہو میں اب بھی جنگل بولتا ہے

ے وہی منزل تھا وہی خود مرا رہبر نکلا   میں الگ سمجھا تھا جس کو مرے اندر نکلا

ے میرا مستقبل تو تیرے ہاتھ پر تحریر تھا
اور میں ڈھونڈ رہا ہوں اپنا مستقبل کہاں

شباب کی غزلیں فکر انگیز ہیں۔ ان میں نئی نئی تشبیہات و استعارات کا استعمال کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ الفاظ کا سادہ اور دلکش برتاؤ بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ اِن کی غزلوں میں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے نرم و نازک الفاظ بھی ملتے ہیں۔ خوبصورت تراکیب اور بلیغ محاورات بھی کہیں کہیں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ شاعر نے ان غزلوں میں چند اچھی اور خوبصورت علامتیں بھی پیش کی ہیں جن سے اِن کی غزلوں کی تازہ کاری میں اضافہ ہوگیا ہے۔ شباب کا اسلوب نہائت ہی سادہ اور پاکیزہ ہے۔ بعض غزلیں بڑی مشکل اور پیچیدہ بحروں میں لیکن ان میں بھی شاعر نے اپنے ...

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

جا بکدستی سے وہ حسن پیدا کیا ہے کہ قاری ایک عجیب آسودگی پاتا ہے۔ شباب کی رباعیات اور قطعات بھی داد دینے کے لائق ہیں۔ اُن کے دوہوں میں بھی ایک خاص توازن ملتا ہے مجموعی طور پر اجنبی ہوا ایک نئے زاویۂ نگاہ کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ گیٹ اپ دیدہ زیب۔ طباعت عمدہ اور قیمت مناسب ہے۔

(رسالہ "رہنمائے تعلیم" دہلی)

جلد ۶۳ - شمارہ ۶ - جون ۱۹۹۷ء

تپسوی کون؟ ریاست جموں و کشمیر کے نئے لکھنے والوں کی فہرست میں آنند لہر کا نام قابلِ توجہ ہے۔ اگرچہ وہ ایک ناول نگار کی حیثیت سے اُبھرے۔ لیکن اُن کی آواز اُس وقت غور سے سنی گئی جب ۱۹۸۴ء میں "انحراف" کے نام سے اُن کی کہانیوں کا مجموعہ منظرِ عام پر آ گیا۔ ان کہانیوں میں بقولِ کمار پاشی موجودہ سیاسی اور سماجی نظام کی کمزوریوں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ ۱۹۸۶ء میں اُن کے ڈراموں کا مجموعہ "نردان" شائع ہوا۔ یہ ڈرامے بھی اُن کی کہانیوں کی طرح دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہیں۔

"تپسوی کون؟" آنند لہر کا تازہ ترین ڈراما ہے جو انھوں نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ اناسی ۷۹ صفحات پر مشتمل یہ ڈراما تیرہ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر ایک حصہ نئی صورتِ حال لے کر سامنے آتا ہے لیکن کرداروں کے تال میل اور پلاٹ کی گرفت نے ڈرامے میں تسلسل برقرار رکھا ہے۔ کہانی ایک ایسے گھر سے شروع ہوتی ہے جہاں ایک طرف ایمانداری کا ڈنکا بج رہا ہے اور دوسری طرف بے ایمانی اور رشوت خوری کا بازار گرم ہے۔ یہ تضاد اور ٹکراؤ کی کہانی ہے جس کو آنند لہر نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ ڈرامے کے اول سے آخیر تک کشمکش پائی جاتی ہے۔ لیکن جس طرح ہمیشہ صداقت اور سچائی کی جیت ہوتی ہے اور جھوٹے اور فریبی بے نقاب ہو کر قدم قدم پر رسوا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح آنند لہر کے اس ڈرامے میں سچ اور اہنسا کی جیت ہوتی ہے۔ شنکر جیسا ایماندار باپ اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ ابھرتا ہے لیکن اس کے برعکس اُس کا بیٹا شو بے ایمانی اور دغابازی کو اپنا دھرم سمجھتا ہے۔ اس طرح سے تصادم اور ٹکراؤ اس ڈرامے کو ہر موڑ پر نظر آتا ہے۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

آنند لہر جدیدیت سے متاثر ہیں لیکن وہ روایت کی پاسداری بھی رکھتے ہیں۔

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

انھوں نے سماج کے بہت ہی حساس اور نازک پہلوؤں پر قلم اٹھایا ہے۔ تپسوی کون؟ میں بھی اس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ڈرامے میں چھوت چھات کا مسئلہ بھی اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ سدھیر مسں نلنی سے شادی کرنے کا خواہشمند ہے لیکن اونچ نیچ کا سوال درمیان میں حائل ہے۔ شنکر ایماندار ہے لیکن پرانے اور فرسودہ خیالات کا حامی۔ اس لئے وہ اپنے بیٹے سدھیر کی اس خواہش کی زبردست مخالفت کرتا ہے کہ وہ مس نلنی جیسی غیر برادری سے تعلق رکھنے والی لڑکی سے شادی کرے۔

ڈرامے میں شو، شنکر، سریش، سرتیا، نرملا، رمن، سدھیر، رمیش، نرائن، مس ورما، ساما، اروڑہ، گوپی چند، گوپال، الوج اور اُن کے علاوہ بیسیوں کردار جابجا نظر آتے ہیں۔ اناسی صفحات پر مشتمل اس مختصر سے ڈرامے میں کرداروں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ڈرامے کی فضا کو مدہم بنا دیتا ہے۔ پڑھنے والا کرداروں کی بھول بھلیوں میں کھو جاتا ہے۔ بعض غیر ضروری کردار بھی سامنے آجاتے ہیں جن کو آسانی سے خارج کیا جا سکتا تھا۔

آنند لہر مکالمہ نویسی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ وہ اپنے مکالموں کے ذریعے سے کرداروں کو حرکت و حرارت بخشتے ہیں۔ اُن کے مکالموں میں زبان کی گراں باری محسوس نہیں ہوتی بلکہ وہ انوکھے انداز میں اپنی بات دوسروں تک پہنچا دیتے ہیں۔ اُن کا لہجہ نرم اور ملائم ہے جو ڈرامے کی کامیابی کا ضامن ہے۔ اس ڈرامے کو ادارہ فکر جدید نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ڈسٹ کور نہایت ہی معنی خیز

G.M.C.E.J
3534

Gandhi Memorial College
SRINAGAR
Acc. No: 3534
Dated: ....

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

● — پریمی رومانی کے اسلوب میں ایک خاص قسم کی شگفتگی ہے جو اس لئے زیادہ تعجب خیز ہے کہ اُردو اُن کی مادری زبان نہیں۔ ان کا قدم خوب سے خوب تر کی جانب اُٹھ رہا ہے۔ اگر وہ اسی طرح ترقی کرتے رہے اور اپنے مخصوص میدان تنقید یعنی جدید اُردو شاعری سے باہر نہ بھٹکے تو یقیناً کچھ عرصہ کے بعد اُردو ادب میں اُن کی آواز غور سے سنی جائے گی۔

پروفیسر مسعود حسین خان
سابقہ وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

● — پریمی رومانی کشمیر کے ایک اُبھرتے ہوئے نوجوان ناقد ادیب ہیں۔ وہ نئی اُردو شاعری کے مزاج سے آشنا ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ وہ عصری ادب اور نئے ادب کے فرق و امتیاز سے واقف ہیں۔ پریمی کے تنقیدی مضامین میں اندرونی وحدت ہے جو بلاشبہ اُن کے تنقیدی شعور کی دلیل ہے۔

پروفیسر عالم خوندمیری
(حیدر آباد)

● — پریمی رومانی اُردو شاعری خاص کر نئی اُردو شاعری کے ایک محنتی ہوش مند اور حساس قلم کار ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ اپنے معاصرین پر قلم اُٹھاتے ہوئے ایک ناقد کے لئے جو غیر جانبدارانہ رویہ جرأت مندی اور تاثر پذیری ناگزیر ہے۔ پریمی نے اس کا حق ادا کیا ہے۔

پروفیسر حامدی کاشمیری
سابقہ وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی سرینگر

● — پریمی رومانی کے تنقیدی رویے اور اختصار کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان میں پرکھنے اور پھر اپنی پرکھ کی روشنی میں فیصلہ دینے کی ہمت پیدا ہو چکی ہے۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

سابقہ سکریٹری، دہلی اُردو اکادمی، دہلی

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

پریمی رومانی جموں و کشمیر کے ایک باصلاحیت ادیب ہیں۔ وہ ایک بڑے ادیب باپ کے بیٹے ہیں۔ ادب سے شغف انھیں ورثے میں ملا ہے۔ اول اول انھوں نے اپنے والد ڈاکٹر برج پریمی کے کچھ مطبوعہ اور کچھ غیر مطبوعہ مضامین اور مسودوں کی ترتیب و تبئین کرکے چھپوانے کی جد و جہد کی۔ اس جد و جہد نے ان میں خود بھی ادب و ادیب کے مختلف گوشوں پر غور کرنے کا شوق پیدا کیا۔ وہ بڑے مرنجاں مرنج، غیر متعصب اور غیر جانبدار اہل قلم ہیں۔ اس خصوصیت نے انھیں مختلف مکتبۂ فکر کے شاعروں اور ادیبوں کے کمال فن کو پرکھنے اور ان کا مقام و مرتبہ متعین کرنے میں مدد دی۔ ان کو جب بھی موقع ملتا ہے وہ ہر اچھے اور بڑے شاعر اور ادیب سے ملنے کی اور انھیں سے ان کے کلام و رشحات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں بڑا توازن اور نپا تلا اندازِ فکر ملتا ہے۔ ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ جدید اردو شاعری۔ چند مطالعے ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا تھا جس کی سنجیدہ حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔ اور بڑے اہل قلم نے ان کی اس کاوش کو سراہا۔ اس سے ان کا حوصلہ اور بڑھا اور مختلف جدید شاعروں کے کلام کے جائزے پر مشتمل انھوں نے دوسرا مجموعہ ردعمل کے نام سے شائع کیا۔

ردعمل میں اختر الایمان، خلیل الرحمن اعظمی، بلراج کومل، کرشن موہن، محمود سعیدی، فریدنا، شہریار، اور مظہر امام اور آزاد غزل کے حوالے سے ان شاعروں کی نظموں اور غزلوں کا بڑی عرق ریزی سے جائزہ لیا ہے۔ مزید برآں ساقی فاروقی، زبیر رضوی، بمل کرشن اشک، حامدی کاشمیری، محمد علوی، ندا فاضلی کے گیت وغیرہ کا بھی جائزہ ہے۔ آخر میں اپنی شناخت کروائی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مصنف کو اردو تنقید میں جگہ بنانے کے لئے کافی جد و جہد کرنی پڑ رہی ہے۔ زندگی کی پریشانیاں محرومیاں اور تشنگیاں پیچھا نہیں چھوڑتیں مگر ان کے حوصلے اور جذبۂ زندگی کی داد دینی پڑتی ہے کہ ان سب کے باوجود ان کا حوصلہ بلند اور قلم رواں دواں ہے۔ لیکن ان کی صاف ستھری نثر، شستہ مقالہ، شستہ انداز بیان اور غیر جانبدارانہ جائزہ ان کی تنقید میں انفرادیت پیدا کر دیتا ہے۔ اور یہ انفرادیت مستقبل کی ایک بڑی بشارت بن کر نمودار ہونے والی ہے۔ اس باصلاحیت نقاد سے بڑی امیدیں بندھی ہیں۔ زیر طبع تصنیفوں کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو تنقید سے ان کو کتنا شغف ہے۔ وہی جوش و جذبہ ہی ان کو اردو کے اچھے نقادوں کی صف میں جلد ہی کھڑا کر دے گا۔

پروفیسر منظر اعظمی (ڈی)
سابق صدر شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی جموں

۳ جنوری ۱۹۹۶ء

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant